ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اپریل۔۔جولائی ۲۰۲۱ء | جلد ۱۲ & ۱۳ | شمارہ ۱۰ تا ۱۲ & ۱ | شعبان المعظم تا ذیقعدہ ۱۴۴۲ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس ادارت

- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- مولانا محمد قمر الزماں ندوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218

محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: ——— 25:00روپے
سالانہ: ——— 250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: ——— 500:00روپے
بیرونی ممالک: ——— 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): ——— 4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by, MD Hifzur Rahman Nadwi , Mob No 9528097025

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	قرآن کا علماء سے خطاب	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے ۱۔ یوپی حکومت کا نیا مجوزہ قانون (نئی آبادی پالیسی) ۲۔ ۷۵واں یومِ آزادی ۳۔ مدیر محترم کو صدمہ	محمد فرید حبیب ندوی	۳
۳۔	مطالعۂ قرآن	اللہ کے محبوب بندوں کی خصوصیات	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۸
۴۔	// //	قرآن مجید کی تاثیر سے محرومی کے اسباب اور حل	مولانا عبدالقوی ذکی حسامی	۱۴
۵۔	تاریخِ قرآن	تدوین قرآنِ کریم کے مراحل-ایک جائزہ	محمد رفعت ندوی	۱۷
۶۔	اسلامی تعلیمات	احسان شناسی؛ایک اعلیٰ انسانی صفت	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۲۱
۷۔	تعلیم وتربیت	گھر میں دینی نشست کی ابتدا کیسے کی جائے؟	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۲۵
۸۔	نقد وادب	اسلوب تحریر جس کے پیرہن سے خوشبو آئے	ابوفہد ندوی	۳۲
۹۔	پیام عمل	آسی یہ غنیمت ہیں تیری عمر کے لمحے	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۴۱
۱۰۔	احتساب	ذمہ دارانِ مدارس ومساجد وجمعیات کے نام	حافظ کلیم اللہ عمری	۴۵
۱۱۔	تجزیہ	اللہ مؤمن عورتوں پر بہت زیادہ مہربان ہے	ابوفہد ندوی	۵۳
۱۲۔	وفات	ہماری یاد جب آئے تو دو آنسو بہا دینا	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۵۹
۱۳۔	// //	آہ! رئیس الشاکری: اب نہ پائے گا زمانہ کبھی ان کی تمثیل	محمد اویس سنبھلی	۶۹
۱۴۔	تعارف وتبصرہ	''ہندوستانی مسلمان اور اسلامی تشخص۔مسائل وحل''	محمد فرید حبیب ندوی	۷۴
۱۵۔	// //	''اصلاح وفساد اور عروج وزوال کا قرآنی سفر''	محمد فرید حبیب ندوی	۷۷
۱۶۔	گوشۂ ادب	غزل	حنیف اخگر	

❋ ❋ ❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

اعتذار

کئی مہینوں سے شمارہ وقت پر شائع نہ ہو سکنے پر ہم آپ کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہیں۔مگر اس کے پیچھے حالات کی ناسازگاری کے ساتھ ساتھ ادارے کی معاشی مشکلات بھی ہیں۔اسی لیے اس وقت آپ کی خدمت میں چار ماہ کا مشترک شمارہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔امید کہ معذرت قبول فرمائیں گے،اور ادارے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔اس وقت ادارہ آپ کی دعاؤں اور تعاون کا سخت محتاج ہے۔ (ادارہ)

یوپی حکومت کا نیا مجوزہ قانون
(نئی آبادی پالیسی)

یوپی حکومت ملک کی بڑھتی آبادی سے بہت پریشان ہے۔وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ کا کہنا ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی،ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اور غریبی کا سبب ہے۔چنانچہ اسی وجہ سے ریاستی حکومت نئی آبادی پالیسی لے کر آئی ہے،اور گزشتہ اتوار کو وزیر اعلی نے نئے مجوزہ قانون کا مسودہ لانچ کر دیا ہے،اور اس پر ۱۹/جولائی تک عوام سے رائیں اور تجاویز طلب کی گئی ہیں۔اور سننے میں آرہا ہے کہ آسام کی بی جے پی حکومت نے بھی اسی طرح کا قانون لانے کا عندیہ ظاہر کیا ہے۔

اس قانون کی رو سے ایک شادی شدہ جوڑے کو زیادہ سے زیادہ دو بچے پیدا کرنے کی اجازت ہوگی۔اگر کسی کے یہاں دو سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں تو اسے بہت سی سرکاری مراعات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ایسا شخص کسی سرکاری ملازمت کا اہل نہیں ہوگا۔اور اگر وہ پہلے سے ملازمت میں ہے تو اسے پرموشن نہیں دیا جائے گا۔اسے کسی طرح کی سرکاری سبسڈی حاصل نہیں ہوگی،اور وہ مقامی بلدیاتی انتخاب میں بھی حصہ نہیں لے سکے گا۔اس بل میں ان لوگوں کو لالچ بھی دیا گیا ہے جو اس پالیسی پر عمل کریں گے۔چنانچہ جو لوگ خوشی سے نس بندی یا تولیدی صلاحیت ختم کروالیں گے،انھیں مختلف

مراعات دی جائیں گی، اور گھروں کی تعمیر وخریداری کے لیے نرم شرائط پر قرضے فراہم کیے جائیں گے اور بہت سے ٹیکسوں میں چھوٹ دی جائے گی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ مسودہ ایسے وقت میں پیش کیا گیا ہے جب کہ چند ہفتوں پہلے چین نے اپنی فیملی پلاننگ پالیسی میں نرمی کا اعلان کیا ہے، اور ہر شادی شدہ جوڑے کو تین بچے پیدا کرنے کی اجازت دی ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ چین نے بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے کے لیے ۱۹۷۹ء میں 'ون چائلڈ' پالیسی نافذ کی تھی، جس کی رو سے ایک جوڑے کو صرف ایک بچہ پیدا کرنے کی اجازت تھی۔ مگر ادھر پینتیس چھتیس سالوں میں بچوں کی شرح پیدائش میں کمی اور عمر رسیدہ افراد کی تعداد میں اضافے کے سبب چین نے اپنی پالیسی تبدیل کی اور ۲۰۱۶ء میں دو بچے پیدا کرنے کی اجازت دی۔ ابھی اس بات کو پانچ سال بھی نہیں ہوئے ہیں کہ چند ہفتے قبل چین نے تین بچے پیدا کرنے کی اجازت کا اعلان کیا ہے۔ اور اب توقع کی جارہی ہے کہ مستقبل قریب میں پیدائش پر عائد پابندیاں مکمل طور پر ختم کردی جائیں گی۔ بعض ذرائع کے مطابق تین سے پانچ سالوں میں ایسا ہوسکتا ہے۔

چین کیوں اپنی پرانی 'ون چائلڈ' اور پھر 'ٹو چائلڈ' پالیسی میں تبدیلی پر آمادہ ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں بچوں کی پیدائش میں بہت بڑی حد تک کمی آ گئی تھی، اور عمر رسیدہ افراد کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی، حتی کہ ماہرین کے مطابق صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ ۲۰۵۰ء تک چین کو عمر رسیدہ افراد کی مالی مدد اور انھیں صحت کی سہولیات فراہم کرانے کے لیے اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ مختص کرنا پڑے گا، اور ان کی دیکھ بھال کے لیے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہوگی۔ آبادی پر کنٹرول کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ ولادت میں صنفی توازن برقرار نہ رہا، اور لڑکیوں کا حمل ضائع کرانے کی وجہ سے لڑکوں کی تعداد، لڑکیوں سے بہت زیادہ بڑھ گئی، حتی کہ ایک رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال وہاں خواتین کی تعداد، مردوں کی بنسبت ساڑھے تین کروڑ زیادہ تھی۔

تو ایسے میں جب کہ چین اپنی پرانی پالیسی تبدیل کررہا ہے، ہمارا ملک اسی غلطی کو اختیار کرنے پہ تلا ہوا ہے جو غلطی پہلے چین نے کی تھی اور جس سے اس نے اب توبہ کرلی ہے۔ اور صرف چین ہی نہیں، ایران بھی اپنے یہاں آبادی بڑھانے پر زور دے رہا ہے۔ چنانچہ خبروں کے مطابق ایران نے اپنے سرکاری اسپتالوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی سہولیات کی فراہمی کو محدود کردیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ اب سرکاری اسپتالوں میں مردوں کی نس بندی نہیں کی جائے گی، اور اسی طرح مانع حمل ادویات صرف ان خواتین کو دی جائیں گی جن کی صحت کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ صوبے کی بی جے پی حکومت جس نے یہ قانون تجویز کیا ہے، اس کے ایم ایل ایز میں سے تقریباً نصف ایم ایل اے ایسے ہیں جن کے دو سے زیادہ بچے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ان میں سے ایک ایم ایل اے کے آٹھ، جب کہ دوسرے کے سات بچے ہیں، اور ان کے علاوہ آٹھ ایم ایل اے ایسے ہیں جن کے چھ چھ بچے ہیں، اور پندرہ کے پانچ پانچ بچے ہیں۔

تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ پالیسی کسی بھی لحاظ سے سودمند ثابت نہیں ہوسکتی۔ بڑھتی ہوئی آبادی ملک کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہوتی؛ بلکہ اگر افرادی قوت سے صحیح سے کام لیا جائے تو وہ ملک کی ترقی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ غربت کا علاج یہ نہیں کہ آبادی پر پابندی لگادی جائے؛ بلکہ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ دولت کو صحیح سے تقسیم کیا جائے۔ وسائلِ دولت پر چند سرمایہ داروں کی غنڈہ گردی کو ختم کرکے ہر ایک کے لیے معاش کے دروازے کھولے

جائیں، اور ملک کی آمدنی کو چند لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنانے کی بجائے، اسے عوام تک پہنچایا جائے، اور سرکاری پیسے میں بدعنوانی اور کرپشن کے مواقع بالکل ختم کر دیے جائیں۔ آبادی پر کنٹرول کی ضرورت اس وقت ہوتی جب قدرتی طور پر غلہ وغیرہ کی پیداوار کم ہوتی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے آبادی بڑھ رہی ہے، قدرت اسی زمین سے آبادی کے لحاظ سے پیداوار نکال رہی ہے۔ مسئلہ پیداوار کی قلت کا نہیں ہے، اصل مسئلہ اس کی صحیح تقسیم کا ہے۔

اس پالیسی کی وجہ سے مستقبل میں ملک کو بھاری نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ اور جن نقصانات کا ملک چین نے سامنا کیا ہے، ہمارے ملک کو بھی مستقبل قریب میں ان نقصانات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ نوجوانوں کی تعداد میں کمی اور سن رسیدہ افراد کی تعداد میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ نوجوان ملک کی ترقی کا زینہ ہوتے ہیں، جب کہ عمر رسیدہ افراد کی ضرورت سے زیادہ تعداد ملک پر بوجھ ہوتی ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی تعداد میں کمی کا مسئلہ صرف ہندوستان کو درپیش نہیں ہوگا؛ بلکہ یہ عالمی مسئلہ بن کر دنیا کے سامنے آئے گا اور سخت ترین حالات پیدا کرے گا۔ بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۱۰۷ء میں دنیا بھر میں پانچ برس سے کم عمر بچوں کی تعداد ۶۸۱ ملین تھی، جو اس صدی کے اختتام تک محض ۴۰۱ ملین رہ جائے گی۔ اسی طرح دوسرا مسئلہ اسقاطِ حمل کی کثرت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ایک تو ہمارے ملک میں پہلے ہی سے لڑکیوں کی پیدائش پر ناخوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، اور انھیں ماں کے پیٹ میں ہی ختم کر دیا جاتا ہے، اب اس پالیسی کے بعد، بچی ہونے کی صورت میں لوگوں کو اسقاطِ حمل کرانے کا گویا موقع ہاتھ آجائے گا۔ اس سے ایک تیسرا مسئلہ صنفی توازن کے بگھراؤ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ جب بچیوں کو پیٹ میں ہی قتل کر دیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں لڑکوں کی تعداد زیادہ ہو جائے گی، اور لڑکیوں کی تعداد کم سے کم رہ جائے گی۔

یہ مسودہ یوپی الیکشن سے قبل لانچ کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے دراصل الیکشن کا ماحول بنانا ہے؛ اس لیے کہ عام طور پر یہ سمجھا اور باور کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں ولادت کی شرح زیادہ ہے۔ اس طرح عام ہندوؤں کو یہ لگے گا کہ یہ قانون مسلمانوں کے خلاف لایا گیا ہے، اور اس طرح وہ یوگی حکومت کے اس فیصلے سے خوش ہوں گے؛ لیکن مسلمانوں کو اس موقع پر سمجھ داری کا ثبوت دینا چاہیے۔ انھیں سمجھنا چاہیے کہ یہ بل صرف ان کے خلاف نہیں ہے؛ بلکہ اس سے جس طرح وہ متاثر ہوں گے، اسی طرح دوسرے طبقات بھی متاثر ہوں گے۔ اس لیے اگر وہ اس کی مخالفت کریں بھی تو مذہب کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ اس کی وجہ سے ملک کو ہونے والے نقصان کو بنیاد بنائیں اور دیگر طبقات کو ساتھ ملائیں۔ خبروں کے مطابق خود وشو ہندو پریشد نے بھی اس بل کی مخالفت کی ہے، اور سیاسی طور پر کانگریس اور سماجوادی پارٹی نے بھی اپنی مخالفت درج کرائی ہے۔

۷۵واں یوم آزادی

ہفتے دو ہفتے بعد ہم پچھتر ہواں یوم آزادی منا رہے ہوں گے۔ خدا کرے کہ یہ ۷۵واں جشن آزادی ہمارے ملک کو حقیقی آزادی کی سمت قدم بڑھانے پر متوجہ کر دے۔ اہالیانِ اقتدار اور عوام دونوں کو آزادی کی صحیح قدر و قیمت سے واقف کرا دے؛ اس لیے کہ ملک ابھی تک حقیقی آزادی سے لطف اندوز نہیں ہو سکا ہے، اور وہ آج بھی ایسی آزادی کا خواب دیکھ

رہا ہے، جس میں ٹوٹے دلوں کو تسکین ملے۔ مرجھائے چہروں پر تبسم کھلے۔ دہشت وخوف کے ماروں کو چین وسکون نصیب ہو، اور حق داروں تک ان کا واجبی حق پہنچے۔ ایسی آزادی جس میں دوغلا پن نہ ہو۔ جس میں فریب نہ ہو۔ جس میں دولت واسبابِ دولت پر چند سر برآوردہ لوگ کنڈلی مارے نہ بیٹھے ہوں۔ جس میں ہر ایک کو ہنسنے اور مسکرانے کا پورا حق ہو۔ جس میں کسی کی مذہبی آزادی پر قدغن نہ لگائی جاتی ہو۔ جس میں کسی کے لبوں سے مسکراہٹ اور چہرے سے خوشی نہ چھینی جاتی ہو۔

آزادی کے اس موقع پر ضروری ہے کہ ملک کو آزادی کے صحیح مفہوم سے واقف کرایا جائے۔ اس لیے کہ حقیقت میں نہ ارباب اقتدار اس کے مفہوم سے پوری طرح واقف ہیں اور نہ زیر اقتدار عوام۔ اور اگر واقف ہیں تو دانستہ نادان بنے بیٹھے ہیں۔ اس لیے انھیں آزادی کا سبق پڑھانا نہایت ضروری ہے۔ اقتدار پر قابض حکمرانوں کو یہ سبق دینا ہے کہ کوئی بھی ملک اسی وقت صحیح طور پر آزاد رہ سکتا ہے جب اس کے اربابِ سیاست وحکومت، ملک کے عوام کے تئیں وفادار ہوں۔ وہ ملک کی ترقی کے خواہاں ہوں نہ کہ اس کی تنزلی پہ کمر بند۔ وہ ملک کو حقیقی آزادی کی سمت لے کر جانے والے ہوں، نہ کہ اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والے۔ اور عوام کو یہ پیغام سمجھانا ہے کہ آزادی کا حصول انسان کی زندگی کا بنیادی مشن ہے۔ غلامی کی زنجیریں جب کسی قوم کو جکڑ لیتی ہیں تو وہ قوم اپاہج بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ اس بات کی کوشش رہنی چاہیے کہ ملک کی پیشانی کبھی بھی آزادی کے جھومر سے محروم نہ ہونے پائے۔ ملک کے دونوں طبقوں کو آزادی کے صحیح مفہوم سے واقف کرانے کی ذمے داری بھی مسلمانوں کو ہی ادا کرنی ہے؛ اس لیے کہ آزادی کے صحیح مفہوم سے پورے طور پر وہی واقف ہیں۔

جشنِ آزادی کے اس موقع پر مسلمانوں کو ایک اور کام بھی کرنا ہوگا۔ یہ جشن ہر سال آتا ہے اور گزر جاتا ہے، مگر مسلمان اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ جشن برائے جشن کی بجائے انھیں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود اپنی قوم کو بھی اور برادران وطن کو بھی آزادی کی صحیح تاریخ سے واقف کرانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ۷۵ سال میں ۳۵، ۴۰ سال بھی اس جشن کے موقع پر ملک کے سامنے مسلمانوں نے صحیح تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی ہوتی تو آج یہ صورت حال نہ ہوتی۔ اس موقع پر برادران وطن کو اپنے پر گراموں میں دعوت دے کر ان کے سامنے مسلمانوں کی قربانیوں کا تذکرہ کیا جائے اور اصل تاریخ بیان کی جائے۔ اسکول کے طلبہ کے درمیان اس موقع پر چھوٹے چھوٹے مسابقے کروائے جائیں اور ان میں ایسے عناوین طے کیے جائیں جن سے مسلمانوں کی قربانیوں سے بھری تاریخ ملک کے سامنے آئے اور لوگوں کو پتہ چلے کہ کس طرح کچھ لوگوں نے تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کو یہ سمجھنا ہوگا کہ دنیا کو اپنی تاریخ سے واقف کرانے کا کام انھی کو کرنا ہے۔ کوئی اور یہ کام نہیں کرے گا۔

مدیر محترم کو صدمہ

یہ خبر قارئین کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں ہوگی کہ ۱۷ جولائی ۲۱ء کو مدیر محترم ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب کو اپنی والدہ محترمہ کی وفات کے سخت صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کئی ہفتوں سے بیمار اور اسپتال میں ایڈمٹ تھیں، مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ اتنی

جلدی چھوڑ کر چلی جائیں گی۔وہ تقریباً ستر سال کی تھیں۔ بڑی نیک وصالح اور دین دار خاتون تھیں۔انھوں نے سادگی اورصبر وقناعت سے بھرپور زندگی گزاری۔سوگواران میں دیگر عزیز واقارب اور شوہر محترم کے علاوہ دو صاحبزادے اورایک صاحبزادی ہیں،جن میں طارق صاحب سب سے چھوٹے ہیں۔طارق صاحب کے لیے یقیناً یہ ایک ناقابل برداشت حادثہ ہے؛ کیوں کہ ماں دنیا کی سب سے انمول نعمت ہے۔ماں کے چلے جانے کے بعد دنیا ویران اورسونی سونی ہوجاتی ہے۔گھر کی فضا کاٹ کھانے دوڑتی ہے۔ایک ماں ہی ہوتی ہے جس کی محبت بے لوث اور بے انتہا ہوتی ہے۔ماں کا چلے جانا گویا زندگی کا ویران ہوجانا ہے۔مگر یہ قدرت کا نظام ہے کہ جو آیا ہے،وہ جا کر ہی رہے گا۔اگر کسی کے لیے دنیا میں حیاتِ دوام ممکن ہوسکتی تھی تو وہ صرف ذات رسالت مآب ﷺ کے لیے ممکن تھی،مگر ان سے بھی کہہ دیا گیا کہ ''آپ کو بھی موت آنی ہے،اور اِن تمام لوگوں کو بھی موت آنی ہے''۔اوراگر دنیا میں کسی کے لیے کسی کی جدائی کا سب سے بڑا کوئی حادثہ ہوسکتا ہے تو صرف صحابۂ کرام کے لیے حضور ﷺ کی وفات کا حادثہ ہے،جس نے صحابۂ کرام کو پاگل وبے قرار کر دیا تھا،مگر انھیں بھی صبر کرنا پڑا۔پھر حضور ﷺ کی زندگی میں تو صبر کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔خود آپ ﷺ کو اپنی ماں کی وفات کا حادثہ محض چھ برس کی عمر میں برداشت کرنا پڑا،جب کہ آپ پوری طرح ماں کی ممتا سے لطف اندوز بھی نہ ہو پائے تھے۔اور والد کی وفات تو آپ کی پیدائش سے قبل ہی ہوچکی تھی۔غرض آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں شروع سے آخر تک نہ جانے کتنے عزیزوں کی وفات کا سامنا کیا،اور ہر موقع پر صبر سے کام لیا۔اس لیے ہمیں امید ہے کہ یقیناً طارق صاحب اوران کے اہل خانہ کے لیے یہ بڑا سخت حادثہ ہے،مگر وہ اِن شاء اللہ صبر جمیل سے کام لیں گے۔ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اوران خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہیں۔مرحومہ کی زندگی اور خاص کر وفات سے قبل کے جو حالات سامنے آئے ہیں،ان سے امید ہے کہ ان شاء اللہ ان کی مغفرت ہوچکی ہوگی۔اللہ پاک سے دعا ہے کہ ان کے تمام گناہوں اور سیآت کو معاف فرمائے۔ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے،اورانھیں انبیاء وصدیقین وشہداء کی معیت ورفاقت نصیب فرمائے،اوران کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔آمین۔

محمد فرید حبیب ندوی

☆☆☆

❑ مطالعۂ قرآن

اللہ کے محبوب بندوں کی خصوصیات

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

رجوع وانابت

اللہ کے نیک اور محبوب بندوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر نیکیوں کے باوجود اندھیری راتوں میں اٹھ کر اپنے رب کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں اور اس سے آہیں بھر بھر کر سسک سسک کر یہ دعا مانگتے ہیں'' وَالَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاما إِنَّهَا سَاءتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً'' وہ اپنے اعمال اور طاعات الٰہی میں مصروف ہونے کے باوجود جہنم کے چمٹ جانے والے عذاب سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور اس کے لیے عملی کوششیں بھی کرتے ہیں، یہاں مستقر اور قیام دونوں لفظ ایک ساتھ آئے ہیں جو ایک ہی معنی میں بھی مستعمل ہیں اور کچھ فرق کے ساتھ بھی ان کا استعمال ہوتا ہے، مستقر مستقل جائے قیام اور مُقامٌ عارضی جائے قیام کے لیے بھی مستعمل ہے (قرطبی ۲/۵۰۶)۔

بری سے بری جگہ انسان کچھ وقت بحالت مجبوری ٹھہر سکتا ہے، لیکن جہنم ایسا برا ٹھکانہ ہے کہ مستقل ٹھکانہ کے طور پر اسے کون اپنانا گوارہ کرے گا، وہ تو عارضی جائے قیام بھی نہیں بن سکتی، یہ اللہ کے بندے یہی دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ بالاطلاق عذاب جہنم سے نجات دے دے، وہ ایسی ہولناک ہے کہ مستقر کیا، مقام کی حیثیت سے بھی اس سے نجات ضروری ہے۔

بخل واسراف سے اجتناب

اس کے بعد ان اللہ کے نیک بندوں کی راہ خدا میں دل کھول کر خرچ کرنے کی تعریف کی گئی اور فرمایا گیا کہ یہ لوگ اپنا مال ناجائز کاموں میں تو خرچ ہی نہیں کرتے اس لیے کہ شریعت کی اصطلاح میں یہ اسراف ہے، مزید یہ کہ جائز ومباح کاموں میں بھی یعنی کھانے پینے اور رہنے سہنے میں بھی یہ لوگ حد سے تجاوز نہیں کرتے، اسراف کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ کے نیک بندوں سے ناجائز کاموں میں خرچ کرنے کا گمان نہیں کیا جا سکتا، لیکن وہ ضرورت اور ایک خوشحال ومتوسط معیار کی زندگی سے زیادہ بھی خرچ نہیں کرتے، اس لیے کہ پھر یہ تبذیر میں داخل ہوگا اور تبذیر اسراف میں داخل ہے، ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُواْ إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورا (الاسراء:۲۷)

اور جو لوگ بے جا خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور نافرمان ہے۔

اسراف کے بالمقابل اقتار کا ذکر ہے، جس کا مطلب خرچ میں تنگی اور بخل کرنا ہے، بخل بذات خود قرآن میں معیوب قرار دیا گیا ہے، اور اسے ناپسند لوگوں کی صفت

قرار دیا گیا ہے:

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (۲۳) الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۲۴) (الحدید:)

(اس سے تم کو اس لیے مطلع کیا جارہا ہے) تا کہ جو کچھ تمہیں نہ ملے اس پر غم وافسوس نہ کرو، اور جو اللہ نے دیا ہے اس پر مت اتراؤ، اللہ تعالیٰ کسی اکڑنے والے مغرور، اور گھمنڈی کو پسند نہیں کرتا، ایسے لوگوں کو جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی تلقین کرتے ہیں (نہ دین کی مدد کرتے ہیں اور نہ کرنے دیتے ہیں) اور جو لوگ بھی حق سے منہ پھیرتے ہیں، اللہ ان سب سے مستغنی ہے، وہ خود ہی قابل تعریف ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ کے نیک ومحبوب بندوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مباح کاموں میں بھی اپنی دولت نہیں لٹاتے اور نہ ہاتھ تنگ رکھتے ہوئے بخیل بن جاتے ہیں، اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے ساتھ دوسروں کے حقوق کا مکمل خیال رکھتے ہیں، فی الحقیقت خرچ کرنے میں بھی وہی اسلامی خصوصیت یعنی اعتدال مطلوب ہے، مگر افسوس کہ آج ہمارے معاشرے کی اکثریت اس حقیقت اور مومنانہ صفت سے ناآشنا ہے، ایک چھوٹا سا طبقہ ہے جو دادعیش کے لیے ہزاروں اور لاکھوں لٹاتا ہے، جبکہ ایک بڑی تعداد نان شبینہ سے محروم للچائی نظروں سے اچھے کھانوں کو ترستی رہتی ہے، بلکہ اچھا لباس، اچھا کھانا اور اچھا مکان مزید اچھا کرنے کی ایسی ریس ہے جس میں مالدار طبقہ آخرت اور دوسروں کے حق سے یکسر غافل ہے، جبکہ محروم، محروم تر ہوتا چلا جارہا ہے، ریس کی انتہا تو صرف موت ہے، ہوس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، قرآن مجید کہتا ہے:

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲) (التکاثر)

تم کو آپس کی ریس اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی دوڑ نے مدہوش کر رکھا ہے، یہاں تک کہ تم (اپنی) قبروں میں پہنچ جاتے ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اسی مطلوب اعتدال کو یوں بیان کیا ہے: **عن أبی الدراء عن النبی ﷺ أنه قال : من فقه الرجل قصده فی معیشته، (رواه احمد :۲۱۶۹۵ ج۳۶)**

اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ مومنانہ اور معتدل رویہ اختیار کیا جائے، بلاضرورت خرچ نہ کیا جائے، ضرورت کے وقت بخل نہ کیا جائے اور خیر کے کاموں میں خرچ کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

لیکن ذرا جائزہ لیتے چلیے کہ کیا امت کے مالدار طبقہ کا اس پر عمل ہو رہا ہے، صرف شان کے لیے ایک ایک شادی میں بیس بیس تیس تیس لاکھ روپئے لٹائے جاتے ہیں، ضرورت کے نام پر جو کچھ کیا جاتا ہے وہ سو فیصد تبذیر میں داخل ہے، ضرورت ہے کہ اخراجات میں اعتدال کی پالیسی اختیار کی جائے، جس کی تعلیم خود نبی پاک علیہ السلام نے دی ہے۔

شرک سے کی ممانعت

یہاں تک جن علامات وصفات کا تذکرہ تھا ان کا تعلق طاعت وفرمانبرداری سے تھا، آگے جن باتوں کا تذکرہ ہے وہ گناہ، معصیت خالق اور حقوق العباد سے متعلق ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ اس آیت میں ان تین بدترین گناہوں سے اجتناب کا ذکر کیا گیا ہے جن میں اہل عرب مبتلا تھے اور جو تقریبا تمام آسمانی مذاہب میں گناہ ہی قرار دیئے گئے ہیں۔ خداوند رحمٰن کے بندوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرتے، **والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا آخر**، اہل عرب اللہ کو تو مانتے تھے مگر دیوی دیوتاؤں کو اس کا شریک کار قرار دیتے تھے، انہیں شفاعت کا اہل اور تقرب کا ذریعہ سمجھتے تھے:

أَلا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى إِنَّ اللَّـهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّار (الزمر: ۳)

سن لو کہ اللہ کا دین خالص ہے، بے لاگ ہے، اور جن لوگوں نے اللہ کے علاوہ دوسرے سرپرست اختیار کر رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں، اللہ ان کے اختلافات کے معاملہ میں ان کے درمیان فیصلے فرمادے گا، اللہ ایسے شخص کو ہدایت سے نہیں نوازتا جو جھوٹا، منکر اور ناشکرا ہوتا ہے۔

اللہ کو شرک سے اس قدر نفرت ہے کہ اس کو کبھی نہ معاف کرنے کا اعلان فرمادیا ہے:

إِنَّ اللّـهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ وَمَن يُشْرِكْ بِاللّهِ فَقَدِ افْتَرَى إِثْماً عَظِيْما (النساء: ۴۸)

اللہ اس کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اس کے علاوہ جس کے لیے چاہے، دیگر گناہ معاف فرمادے، اور جو شرک کرتا ہے وہ سنگین افترا پردازی کرتا ہے۔

شرک پر اللہ کا غصہ بھڑکتا ہے، شرک کسی طرح کا ہو، اس کی کوئی قسم ہو، وہ ناقابل معافی ہے، اس سے اجتناب لازم ہے، واقعہ یہ ہے کہ آج اکثریت نے توحید کو صرف عبادات میں اور مسجد میں قید کر دیا ہے، باقی سارے معاملات میں باطل کی بالادستی کو قبول کر لیا ہے، جس کے نتیجہ میں پوری دنیا میں مسلمان پست و ذلیل اور کمزور ہیں، جب تک مکمل دین کی طرف رجوع نہیں کرتے تب تک اللہ کی طرف سے نصرت کی امید کرنا خام خیالی ہے، خدا نے جہاں غلبہ و استحکام کا وعدہ فرمایا ہے وہاں ایمان کامل اور شرک سے براءت کی شرط لگادی ہے:

وَعَدَ اللّـهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (النور: ۵۵)

اللہ نے ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت سے نوازے گا، جس طرح ان سے پہلے (اہل حق) کو خلافت دی، اور ان کے دین کو جس کو ان کے لیے پسند فرمایا ہے اقتدار عطا کرے گا، اور ان کی خوف اور بدامنی (کی حالت) کو امن وسلامتی سے بدل دے گا، (ان پر ذمہ داری ہے) کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور جو بھی اس کے بعد کفر کریں گے، وہ باغی اور سرکش ہوں گے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

وَلاَ تَهِنُوا وَلاَ تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْن (اٰل عمران: ۱۳۹)

تم لوگ بزدل اور کمزور نہ پڑو، اور نہ رنج وغم کے شکار ہو، تم اگر مومن ہو تو تمہیں برتر ہو۔

وہ لوگ بڑے مجرم ہیں جو دائرہ کار اور اختیار رکھتے ہوئے بھی، ان **الحکم الا للہ** اور **الا لہ الخلق و الامر**، سے آنکھیں چراتے ہیں، مسجد میں خدا کی عبادت کرتے ہیں، بازار میں، بینک میں، تجارت میں اور حکومت میں اور عدالت میں عالمی مشرکانہ نظام کی پیروی کرتے ہیں، نتیجہ جو کچھ ہے وہ عراق سے لیبیا تک اور سعودیہ سے شام و یمن تک آپ کے سامنے ہے، جن ممالک میں مسلمان معاہدہ کے تحت رہتے ہیں وہاں مجبور ہیں، لیکن عقیدہ ان کا بھی بے لاگ ہونا ضروری ہے۔ تمنا ان کے اندر بھی ہونا چاہیے اور اللہ سے رجوع کرتے رہنا چاہیے اور دعوتی عمل میں اس قدر لگنا چاہیے کہ غلبۂ اسلام

کی راہ ہموار ہو جائے ،مگر افسوس ہے کہ آج بڑی تعداد سیکولرزم اور لبرلزم اور اس کے تعلیمی ، عدالتی اور معاشرتی نظام کو یہ سمجھتی ہے کہ اس سے اسلام راضی ہے ، اللہ راضی ہے ، انہیں نہیں معلوم کہ معاہدے کے سبب بوجہ مجبوری اس پر عمل ہو رہا ہے۔

قتل ناحق کی ممانعت

بہر حال یہاں پر قرآن مجید نے سب سے خطرناک اور سب سے بڑے گناہ کا ذکر سب سے پہلے کیا، اس کے بعد یہ فرمایا کہ وہ کسی جاندار کو ناحق طریقہ پر قتل نہیں کرتے ، اہل عرب عام طور پر عار کے سبب بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے ، بچوں کو قتل کر دیتے تھے، انھیں صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا تھا:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيراً(الاسراء: ۳۱)

اور اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے ڈر سے مت مارو (انہیں زندہ درگور کرنا تو سخت ترین جرم ہے ہی، ان کو طن مادر میں مار دینا یا اسی فقر کے ڈر سے اولاد پر پابندی لگانا بھی ایک جرم ہے) انہیں اور تمہیں ہم کھلا رہے ہیں، ان کا مار ڈالنا سنگین جرم ہے۔

اس کے علاوہ ان کے معاشرے میں قتل و غارت گری ایک عام وبا تھی ، اللہ تعالی نے فرمایا کہ اس کے نیک بندے قتل ناحق کے قریب بھی نہیں جاتے ، دوسری جگہ پر اور وضاحت کے ساتھ بنی اسرائیل کے پس منظر میں ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل اور ایک جان بچانے کو پوری انسانیت کی حفاظت قرار دیا ہے ، مگر افسوس کہ ہم مسلمان نہ قرآن مجید کے بیان کردہ ان امتیازات وخصوصیات سے خود واقف ہیں اور نہ لوگوں کو واقف کرانے کی کوشش کرتے ہیں ، نتیجہ میں ہمارے سلسلے میں جھوٹے پرو پیگنڈے کئے جاتے ہیں اور ہم دفاعی پوزیشن اختیار کر لیتے ہیں، ارشاد ہے:

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعاً وَلَقَدْ جَاءتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيراً مِّنْهُم بَعْدَ ذَلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمُسْرِفُونَ (المائدہ: ۳۲)

ہم نے اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر یہ قانون عائد کیا تھا کہ جو بھی کسی انسان کو بغیر اس کے کہ اس نے قتل کی کوئی واردات کی ہو، یا کوئی مفسدانہ حرکت کی ہو، قتل کرتا ہے، تو گویا کہ وہ پوری انسانیت کو قتل کرتا ہے، اور جو کسی انسان کی زندگی بچاتا ہے (زندگی کے تحفظ کا انتظام کرتا ہے) تو گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی۔ اور ان کے پاس ہمارے پیغمبر واضح تعلیمات لے کر آتے رہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ حد سے تجاوز کرتے رہے، (اور آج بھی کر رہے ہیں)۔

زنا کی ممانعت

تیسرا بڑا گناہ جو اس معاشرے میں فساد و تعفن اور سڑانڈ کا سبب تھا وہ زنا ہے، فرمایا کہ جو میرے نیک بندے ہیں وہ زنا کے قریب نہیں جاتے ، ظاہر ہے کہ شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے لوگ زنا کا تصور بھی نہیں کر سکتے ، اور یہی ان کی مقبولیت کی علامت اور کامیابی کی ضمانت ہے، زنا کے سد باب اور اس کے دواعی ومقدمات سے اجتناب پر گزشتہ دنوں میں گفتگو ہو چکی ہے۔

اس آیت میں عقیدہ اور عمل سے متعلق دو بڑے بدترین گناہوں کا تذکرہ کر کے فرمایا **ومن یفعل ذلک یلق أثاما**، کہ جو ان گناہوں کا مرتکب ہوگا وہ سزا پائے گا؛ ''اثام'' کا مطلب سزائے گناہ ہے، بعض مفسرین نے اثام جہنم کی ایسی وادی کا نام قرار دیا ہے جس میں سخت عذاب رکھے گئے ہیں ، یہاں دونوں ہی معنی لئے جا سکتے ہیں، جہنم کی اس وادی میں پہنچے گا تو بھی گناہوں کی سزا ملے گی ، اور سزائے گناہ مراد لئے جائیں تو کون کون سے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا معلوم

نہیں، البتہ عذاب سخت ہوگا، اور وہ سخت تر ہوتا چلا جائے گا اگر گناہ کرنے والا مشرک ہو، کیونکہ آگے کی آیت میں ارشاد ہے **یضٰعف لہ العذاب یوم القیامۃ ویخلد فیہ مھانا** اس کا عذاب دوگنا ہوجائے گا کیوں کہ کفر اور اس پر مزید گناہ جس کو کہتے ہیں (کریلا اور نیم چڑھا) اور پھر وہ اس عذاب میں ذلیل وخوار ہوکر رہے گا، اس سے رہائی کفر وشرک کے سبب ممکن نہ ہو سکے گی، دوسری جگہ ارشاد ہے:

الَّذِيْنَ كَفَرُواْ وَصَدُّواْ عَن سَبِيْلِ اللّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَاباً فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُواْ يُفْسِدُونَ (النحل:۸۸)

جو لوگ کفر کر رہے ہیں اور اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں، ان کو ہم دوہرا عذاب ان کی بدمعاشیوں کی وجہ سے دیں گے۔

توبہ

ظاہر ہے کہ مومن سے اگر گناہ ہوجائے تو اس کو ایک گناہ پر ایک ہی سزا ملے گی، اس کا عذاب دوگنا نہیں ہوگا، اسی طرح خلود فی النار بھی کفر وشرک کے ساتھ خاص ہے، مومن اگر گناہگار ہوکر جہنم میں جائے گا تو اپنی سزا کاٹ کر ایک نہ ایک دن نکال لیا جائے گا، (**اللّٰھم احفظنا من عذاب جھنم**)

اس کے بعد کی دونوں آیتیں اس پر دلیل ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں خلود اور تضاعف کا بیان کفار ومشرکین کے لیے خاص ہے، پہلی آیت میں توبہ کے لیے ایمان اور عمل صالح کی شرط رکھی گئی ہے، اور یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ غفور ورحیم ہے، اس لیے ان کی سیئات کو حسنات سے بدل دے گا، یہاں ایمان کی شرط بتاتی ہے کہ وہ بیان کفار ومشرکین کے لیے ہے، ان کی توبہ تب ہی قبول ہوگی جب وہ ایمان لائیں اور عمل صالح کریں، پھر ان کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، جس کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے (**الاسلام یھدم ما کان قبلہ**(**صحیح مسلم: ۱/۱۲۱**)

اس کے بعد کی آیت میں اس مومن کی معافی کا اعلان ہے جو کبھی غفلت کے سبب کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے، مگر پھر وہ توبہ کرلے، اپنے کئے پر ندامت کرلے اور عمل صالح کی انجام دہی میں لگ جائے یعنی آئندہ معصیت میں نہ پڑنے کا عزم کرلے تو گویا وہ اللہ کی طرف اس طرح رجوع ہوگیا جیسے رجوع ہونے کا حق ہے، یوں کہیے کہ اس نے خاص طور پر رجوع کیا اور خاص انداز سے توبہ کی، یہاں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ توبہ کسے کہتے ہیں اور توبہ کی شرطیں کیا ہیں، توبہ کی تین شرطیں ہیں:

۱۔گناہ سے باز آنا

۲۔اپنے کرتوت پر نادم ہونا

۳۔آئندہ ارتکاب نہ کرنے کا عزم کرنا۔

اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو توبہ صحیح نہیں (ریاض الصالحین للامام النوویؒ:۱۳، باب التوبہ) یہ یاد رہے کہ یہ تین شرطیں تب ہیں جب گناہ کا تعلق بندے اور اس کے رب سے ہو، اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو پہلے بندے سے معاملہ صاف کرنا لازمی ہے، توبہ دین کی روح ہے، مومن کی خصوصیت ہے اس کو مومنین کی خصوصیات میں دوسری جگہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدونَ الآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (التوبۃ:۱۱۲)

یہ (اللہ کے بندے) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اللہ کی حمد وثنا کرنے والے، روزے رکھنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے والے، اچھی باتوں کی دعوت دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی نگہداشت اور حفاظت کرنے والے ہیں، ان ایمان والوں کو

خوش خبری سنادیں۔

توبہ انبیاء وصالحین کی صفت ہے، توبہ کرنے والے اللہ کو محبوب ہیں، خدا کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْن (البقرہ: ۲۲۲)

بے شک اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرنے والوں اور اچھی طرح پاکی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

توبہ کے سلسلہ میں بے شمار احادیث ہیں، اللہ کے بندوں کو چاہئے کہ وہ اللہ سے مغفرت طلب کریں اور اس کے سامنے توبہ کریں، وہ اس وقت تک توبہ قبول کرتا ہے جب تک انسان غرغرہ کی حالت میں نہ پہنچ جائے: عن إبن عمر عن النبی ﷺ قال: إن الله يقبل توبة العبد مالم يغرغر. (جامع الترمذی: ۳۵۳۷، ج۵)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل رات کو اپنا ہاتھ دراز کرتے ہیں، (متوجہ ہوتے ہیں) کہ دن کا خاطی توبہ کرے، اور دن کو اپنا ہاتھ دراز کرتے ہیں (متوجہ ہوتے ہیں) کہ رات کا خاطی توبہ کرے۔ اور یہ عمل یعنی توبہ کی قبولیت اس وقت تک ہوتی رہے گی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے۔

"عن أبی موسی عن النبی ﷺ قال: إن الله عزوجل يبسط يده بالليل ليتوب مسيء النهار ويبسط يده با لنهار ليتوب مسيء الليل حتى تطلع الشمس من مغربها" (صحيح مسلم: ۲۷۵۹. ج۶)

انسان سے خطا ہوسکتی ہے، اس کا امکان ہے اور اللہ تواب ورحیم وغفور ہے، اس لیے انسان کو اپنے گناہ سے فوراً توبہ کرلینا چاہئے، عقبہ بن عامرؓ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے کوئی گناہ کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس پر گناہ لکھ لیا جاتا ہے، اس شخص نے کہا پھر وہ استغفار کرتا ہے اور اس گناہ سے توبہ کرلیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مغفرت ہوجاتی ہے اور توبہ قبول کرلی جاتی ہے، اس شخص نے کہا کہ وہ پھر گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کا گناہ لکھ لیا جاتا ہے، اس نے کہا کہ وہ پھر توبہ واستغفار کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر اس کی توبہ قبول کرلی جاتی ہے، آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ اللہ تھکتا اور اکتاتا نہیں اگرچہ تم تھک جاؤ۔ (نضرۃ النعیم، ج۳: ۱۲۸۲)

بات طویل ہوگئی مگر ویتوب الی الله متاباً کی تعبیر کا تقاضہ تھا کہ توبہ پر کچھ گفتگو کی جائے، توبہ انسان کو معافی کی امید کے ساتھ تب تک کرتے رہنا چاہئے جب تک جسم وروح کا رشتہ باقی ہے، صاحب تدبر نے یہاں پر بڑی اچھی بات لکھی ہے:

"﴿وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَاباً﴾ یہ ٹکڑا بالکل ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَاماً﴾ کے مقابل میں ہے اور اس میں توبہ کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے گناہوں کے ساتھ ہی مریں گے وہ تو بہرحال اپنے گناہوں سے دوچار ہوں گے لیکن جو توبہ کرلیں گے وہ نہایت سرخروئی کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹیں گے۔ "متاباً" کی تاکید فخیم شان کے لیے ہے یعنی یہ لوٹنا نہایت عزت وشان کا ہوگا"۔ (تدبر قرآن، ج۵ ص: ۴۸۹)

☆☆☆

❑ مطالعۂ قرآن

قرآن مجید کی تاثیر سے محرومی کے اسباب اور حل

مولانا عبدالقوی ذکی حسامی

امام وخطیب مسجد لطف اللہ حیدرآباد

قرآنِ مجید وہ کتاب ہے ، جو ہر پہلو سے کامل،احسن، جامع اورمنفرد ہے،یہ نوع اِنسانی کی ابدی ہدایت کیلئے نازل کردہ کتاب ہے،جس میں انسان کو منشائے خداوندی کے مطابق زندگی گذارنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے ، نہ صرف یہ؛ بلکہ کتاب کی تلاوت سے قاری ، خداوندِ قدوس سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرسکتا ہے،جس سے انسان کی روحانیت کوغذا ملتی ہے۔یہ تعلق مع اللہ میں معاون ہے۔یہ نبی اکرم ﷺ کا تابندہ وپائندہ معجزہ ہے،ان تمام کے علاوہ اس کلام میں بے پناہ تاثیری قوت موجود ہے۔اس کی نافعیت اور بے پناہ اثر کے معترف زمانہ کے ادباءاور بلند پایہ شعراء رہے ہیں،کفار ومشرکین پس پردہ نبی اکرم ﷺ کی تلاوت سنا کرتے ،اور متاثر ہوتے تھے۔خود حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کا سبب اس قرآن کی سماعت بنی،ابتداء اسلام میں حج کیلئے بیت اللہ کوجو وفود آیا کرتے تھے منافقین ومشرکین ان کو جتاتے کہ نبی اکرم ﷺ کا قرآن کوئی نہ سنے،اس لیے کہ جوسنتا، وہ بس اس قرآن کا گرویدہ ہوجاتا تھا،حضرت ابوبکرؓ مکہ میں جب ایک کافر کی امان میں تھے اسوقت آپؓ کا معمول نماز میں تلاوت جہراً تھا، جس کو سن کر لوگ اسلام کی طرف مائل ہورہے تھے، لاکھ مخالفت کے باوجود اس عمل کو جاری رکھا حتیٰ کہ اس کافر کی امان سے بھی آزاد ہونا گوارہ کرلیا۔اس پاک کلام کا ایک اثر یہ ہے کہ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے،اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے،اللہ فرماتا ہے: انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلییت علیھم آیاتہ زادتھم ایماناً و علی ربھم یتوکلون (انفال) اس آیت میں مومنین کی ایک خوبی یہ بیان کی ہے کہ جب مومن کے سامنے تلاوت قرآن ہوتو اس سے ایمانی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے، مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں: ایمان بڑھنے کے ایسے معنی پر علماء ومفسرین کا اتفاق ہے کہ تلاوت قرآن سے ایمان کی قوت وکیفیت اور نور ایمان میں ترقی ہوتی ہے، (معارف القرآن) قرآن مجید ایک مقناطیسی کتاب ہے جو سننے والے کو اپنی جانب کھینچتی ہے، اگر اس کو زندگی کا لائحہ عمل بنایا جائے تو معاشرہ میں نمایاں تبدیلی یقینی ہے،جس طرح قرن اول میں حضرات صحابہ کرامؓ کی زندگی میں انقلاب آیا،ان کے اخلاق،معاملات،معاشرت،طرز حیات،حتیٰ کہ نظر وفکر اور رجحانات بھی کلیۃ تبدیل ہوگئے،آج بھی اس کی تاثیری قوت وکیفیت مسلم اور علی حالہ موجود ہے،قرآن مجید کی تاثیر

کے سلسلے میں ایک جگہ اللہ نے ارشاد فرمایا: لو أنزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته خاشعا متصدعا من خشية الله (اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تُو دیکھ لیتا کہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ مقام حسرت وافسوس ہے کہ آدمی کے دل پر قرآن کا اثر کچھ نہ ہو حالانکہ قرآن کی تاثیر اس قدر زبردست اور قوی ہے کہ اگر وہ پہاڑ جیسی سخت چیز پر اتارا جاتا اور اسمیں سمجھ کا مادہ موجود ہوتا تو وہ بھی متکلم کے سامنے دب جاتا اور مارے خوف کے پھٹ کر پارہ پارہ ہوجاتا۔ (تفسیر عثمانی)۔ یہ ہے قرآن کی تاثیری قوت جس کو خود اللہ نے بیان کیا ہے، اس سب کے باوجود ہمارے دل کیوں اثر لینے سے محروم ہیں؟ اس کے کیا اسباب وعوامل ہیں ان پر غور کیا جائے اور انہیں دور کرنے کی فکر کی جائے تو یقین ہے کہ ہمارے بھی افعال واطوار، اخلاق وکردار سے اسلام کی خو، بو، آئے گی۔

وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا ہم قرآن کے اثر سے محروم رہ رہے ہیں؟

پہلا سبب: معصیت الٰہی خواہ وہ صغائر ہوں یا کبائر، نفسِ معصیت محرومی کا سبب ہے، کیوں کہ گناہ کی کثرت سے دل سیاہ ہوجاتا اور اس قدر سخت ہوجاتا ہے کہ اللہ نے اس کی سنگینی کو پتھر سے تشبیہ دی؛ بلکہ اس سے بھی سخت بتایا: ثم قست قلوبكم من بعد ذلك فهي كالحجارة او اشد قسوة (البقرۃ) صاحب معارف القرآن اس کے ذیل میں لکھتے ہیں: بعض پتھروں میں ایک آخری اثر تو ہے کہ خوفِ خدا سے نیچے گر آتے ہیں مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین جذبہ انفعال بھی نہیں، (معارف القرآن)۔ ایسے ہی دوسرے مقام پر قرآن ارشاد فرماتا ہے: كلا بل ران على قلوبهم ماكانو يكسبون (المطففین)۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ہماری آیتوں میں کوئی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اصل یہ ہے کہ گناہوں کی کثرت ومزاولت سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گئے (تفسیر عثمانی)۔ ایک دفعہ حضرت حسن بصریؒ کے پاس ایک شخص حاضر ہوا اور کہا کہ حضرت آپ کے درس قرآن سے ہمارے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ لگتا ہے ہمارے دل سوگئے، آپؒ نے فرمایا سو نہیں گئے، مرگئے۔ پوچھا وہ کیسے: فرمایا جو بندہ سوجاتا ہے اس کو ہلانے سے اور حرکت دینے سے اٹھ جاتا ہے، مگر جو بندہ مرجاتا ہے وہ نہ ہلانے سے اٹھتا ہے نہ حرکت دینے سے۔ بالکل ہمارا حال یہی ہے کہ شب وروز میں ہم کئی دفعہ قرآن کی سماعت کرتے ہیں؛ بلکہ ہماری مصروفیات اسی قرآن کے اردگرد گھومتی ہیں، مگر ہمارے قلوب اس کی تاثیر سے محروم ہیں۔ حدیث پاک میں ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: دل کو زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے کو پانی لگنے سے۔ پوچھا گیا: اس کو دور کرنے کی کیا صورت ہے؟ فرمایا نبی ﷺ نے: موت کو بکثرت یاد کرو اور قرآن کی تلاوت کرو۔ ان القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا اصابه الماء قيل يارسول ﷺ وما جلائها؟ قال: كثرة ذكر الموت وتلاوة القرآن (بیہقی)۔

دوسرا سبب محرومی کا قرآن کی بے ادبی ہے۔ ادب وہ شئی ہے، جس نے حضرت جبرئیلؑ کو سید الملائکہ بنایا اور بے ادبی نے شیطان کو شیطان بنایا، نیز تعلیمات اسلامی میں ادب پر خصوصیت سے توجہ دی گئی، ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے ادب سکھلایا اور کیا ہی اچھا ادب سکھلایا: أدبني ربي فاحسن تاديبي (مشکاۃ)۔ ایک اور مقام پر فرمایا کہ الاسلام كله ادب، اسلام سارا کا سارا ادب ہے، یعنی

جس کو ادب ملا وہ نصیب والا ہوا اور جسے بے ادبی ملی وہ شقاوت کا مستحق رہا،قرآن کے ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے باوضواور بااحترام قبلہ رو ہوکر پڑھا جائے ،اللہ فرماتا ہے: لا یمسہ الا المطھرون (الواقعہ)ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قرآن کو ہاتھ نہ لگائے بجز اس شخص کے جو پاک ہو۔(روح المعانی بحوالہ معارف القرآن)۔اس کی طرف نہ پیٹھ کی جائے نہ اس کو نیچے رکھا جائے ،اس پاکیزہ کلام کے ساتھ بے ادبی کرنے والے بہت سے افراد کا انجام تاریخ نے محفوظ کیا اور مشاہدہ بھی اس پر شاہد عدل ہے ،تاہم اس کے اثر سے محرومی کسی عذاب سے کم نہیں۔ اس کی بے ادبی ہی کی ایک مثال ہماری اکثر مساجد اور گھروں میں دیکھی جائے کہ کہیں اگر گرد جمی ملے گی تو وہ اس پاک کلام پر رہے گی۔مجال ہے کہ کبھی ہمارے فون پر اور کبھی ہمارے کپڑوں پر گرد ہو،اور ہم خاموش بہ لب ہوں۔

تیسرا سبب محرومی کا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم سے عدم رغبت اور دلچسپی کا نہ ہو۔جب اسکو پڑھا جائے یا سنا جائے تو بالکل بے توجہی کے ساتھ، نہ الفاظ قرآنی کی طرف نظر اور نہ معانی قرآن کی جانب غور رہتا ہے ،ایسی صورت میں کُجا مراد الٰہی کی تفہیم نصیب ہوگی۔فہم قرآن کے بعد عمل کا نمبر ہے جو مقصود ہے سارے احکام کا، ہمارے معاشرہ میں قرآن کے ساتھ جو رویہ روزمرہ رہتا ہے اس کو الفاظ میں ضبط کر سکتے ہیں نہ قید تحریر میں لا سکتے ہیں،اس کے ساتھ کسی نے سلوک کیا ہے تو اتنا کہ دکان ومکان کے خیر وبرکت کے لیے تلاوت کا اہتمام کروایا ہے،اور کسی نے اس سے بڑھ کر کیا تو اپنی اولاد میں سے کسی کو حافظ بنادیا اور یہ سمجھا کہ میں نے حق واجب ادا کیا اور اسی کو مقام منزل سمجھ کر اکتفا کیا۔ اس سے بڑھ کر اس قرآن کو ختم قرآن کے نام سے وظیفہ روز گار بنالیا اور باضابطہ اشتہارات مختلف مقامات پر آویزاں کئے،اور حیرت ہے کہ گھنٹے بھر میں مکمل قرآن بھی ہوجاتا ہے ،الامان الحفیظ۔

چوتھا سبب قرآن کے اثر سے محرومی کا یہ ہے کہ ہم نے اپنے معمولات یومیہ میں اس کی تلاوت کا خانہ نہیں بنایا، جو قرآن سے تعلق کا پہلا زینہ ہے، حالانکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کا معمول اس سے بہت مختلف تھا۔ ہر روز ایک قرآن کا ختم ہوتا تھا ،بعض کا دو بھی منقول ہے ،انہیں اس معمول کے پورا کرنے میں زمانہ کے تقاضہ حائل نہ ہوتے تھے ،اور ہمیں کسی کام کے پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ،مگر رکاوٹ آتی ہے تو احکام شرعیہ کے بجالانے اور تلاوت قرآن کا اہتمام کرنے میں۔م

نجملہ اور وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ محرومی کی ہے کہ ہم اس میں پنہاں ہدایت کو اللہ سے نہیں مانگتے ،جس کے ہاتھ میں ساری انسانیت کے قلوب ہوں وہ ہمارے دل کی آواز کو نہ سنے بشرطیکہ خلوص نیت اور حضورِ قلب سے مانگا جائے ،محال ہے۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ایک جگہ قرآن سے استفادہ کے موانع لکھتے ہیں: قرآن سے استفادہ اور ہدایت کے موانع کو قرآن نے کفار کی محرومی کے تذکرہ کے ساتھ ذکر فرمایا۔آگے فرماتے ہیں: کفار کے علاوہ اگر مسلمانوں میں بھی یہ موانع پائے جائیں گے تو قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے میں حارج ہوں گے۔ وہ یہ تین ہیں: (۱)تکبر (۲)مجادلہ (۳)انکار آخرت اور دنیا پرستی۔(تلخیص۔مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی) نیز حضرتؒ نے قرآن سے استفادہ میں معین چند اصولی باتیں ارقام کی ہیں:(۱)طلب (۲)استماع واتباع (۳)خوف (۴)ایمان بالغیب (۵)تدبر(۶)مجاہدہ(۷)ادب وعظمت۔(حوالۂ سابق)

☆☆☆

□ تاریخ قرآن

تدوینِ قرآن کریم کے مراحل-ایک جائزہ

محمد رفعت ندوی

تمہید

قرآن، مذہبِ اسلام کی ایک مقدس وعظیم کتاب ہے۔ یہ کتاب ہدایت ''ہُدی للناس'' منزل من اللہ ہے۔لاریب فیہ کا واضح اعلان اور شک کرنے والوں کے لئے کھلا چیلنج بھی ہے۔قرآن میں ترمیم وتخفیف اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ،تو اللہ غیب سے اس کی حقانیت وحفاظت کی سبیل پیدا فرما دیتا ہے۔مختلف عہود وعصور میں اللہ نے یہ کام کر دکھایا۔آج پھر مختلف بلاد و ممالک میں قرآن کے حوالے سے ناپاک عزم کیا جارہا ہے،مگران کے لیے قرآن میں خرد برد کرنے پانے میں کامیابی کی راہ بالکل مسدود نظر آتی ہے۔چوں کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لی ہے۔ہم خوش نصیب ہیں کہ اللہ رب العزت نے اس کا امین و پاسباں ہمیں بنایا۔ہم نے اس کو سینہ میں اتارا، دماغ میں بسایا۔جب کہ اسے اللہ رب العزت نے دیگر چیزوں پر پیش کیا تو اُس نے اِس بارگراں کے اٹھانے سے انکار کردیا۔قرآن گواہ ہے۔انا عرضنا الامانة على السمٰوات ------- لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته خاشعا متصدعا --------(۱)

آسماں بار امانت نہ توانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدن (۲)

ایک اردو کا شاعر اس کی یوں ترجمانی کرتا ہے:

زمیں بھی عاجز رہی جس سے، فلک بھی جس کو اٹھا نہ پایا
جنونِ ذوقِ طلب سلامت، وہ بار میں نے اٹھا لیا

قرآن وہ نسخۂ کیمیا ہے جس نے مِس خام کو کندن بنایا اور قوموں کو حیاتِ نو بخشی۔یہ قوت وصفت اللہ رب العزت نے اس میں رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لیے رکھ دی ہے۔اس کی تاثیر سراپا ہدایت ہے۔اس میں شک وتذبذب کی گنجائش نہ اس زمانے میں تھی نہ اب ہے۔اللہ نے اس کو ہر طرح سے محفوظ رکھا ہے۔مولانا حمید الدین فراہی - رحمۃ اللہ علیہ - رقمطراز ہیں۔ **''قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلم ہے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے۔''**(۳) اب حاملین قرآن بھی اللہ کے امن و امان میں ہیں۔ یہ ہمارا کامل ایمان و یقین ہونا چاہئے۔لوگوں پر ذمہ داری ہے کہ اسے من وعن اپنی نسلوں میں پہنچائیں۔جس طرح سابقہ امتوں نے اپنے اپنے صحیفوں کی اپنے اپنے اعتبار سے حفاظت کرنے کی کوشش کی؛ لیکن وہ تحریف وتغییر سے بچ نہ سکی۔لہذا آج بھی ادیان اخریٰ کی تحریف شدہ ایڈیشن صحیفۂ آسمانی موجود ہے۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی - رحمۃ اللہ علیہ - **دنیا میں متعدد قومیں ہیں جن کے پاس حسبِ ادعا وزُعم کتب الٰہی محفوظ ہیں۔**(۴)

لیکن قرآن کا حال اس سے الگ ہے۔بلاریب اِس قرآن کی حفاظت کے لئے اللہ نے ضروری اہتمام کیا ہے۔''خیر من الف شھر'' مقام؛''بلد امین'' منزل بہ؛ امین، منزل منہ، امین اور منزل الیہ؛ امین ان صفات کا انتخاب فرمایا۔ آیئے !ذرا اس کی ترتیب و تدوین میں اہتمام کا جائزہ لیتے ہیں، جس سے اصحاب واکابر کی قرآن کے بارے میں غایت درجے کی احتیاط معلوم ہو سکے۔

تدوین قرآن

عربی لفظ 'دون' سے تدوین بطور مصدر استعمال ہوا، جس کے معنی ہیں: ترتیب دینا۔تدوین قرآن کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اُس مقدس کتاب کے لیے وصف کے طور پر استعمال ہوا اور بعد میں اِس نے نام کی حیثیت حاصل کر لی۔مفہوم عام میں کلمات الہیہ کو بالترتیب عین منشائے رب کے مطابق تحریری صورت میں بین الدفتین یکجا وجمع کرنا 'تدوین قرآن' کہلاتا ہے۔(۵)

تدوین قرآن کی ابتدا

تدوین و تبویب قرآن کریم کے مختلف مراحل ہیں۔امام حاکم اپنی مستدرک میں تحریر فرماتے ہیں:

ان جمع القرآن لم یکن مرة واحدة فقد جمع بعضه بحضرة رسول الله - صلی الله علیه و آلہٖ وسلم - ثم جمع بعضه بحضرة ابی بکر الصدیق ، و الجمع الثالث هو فی ترتیب السورة، کان فی خلافة امیر المؤمنین عثمان بن عفان - رضی الله عنه- (٦)

معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی حفاظت و کتابت تین مرتبہ ہوئی۔جیسا کہ علامہ زرقانیؒ قرآن کی کتابت جو دراصل حفاظت کی نوع ہی ہے، نام لے کر لکھتے ہیں۔:

کتابته حدث فی الصدر الاول ثلاث مرات: الاول فی عهد النبی - صلی الله علیه و آلہٖ وسلم - الثانیه فی خلافة ابی بکر الثالثه علی عهد عثمان غنی - رضی الله عنه- (۷)

صدر اول میں قرآن کریم کی حفاظت کا کام تین مرتبہ پیش آیا۔پہلی بار عہد نبوی میں اور دوسری بار حضرت ابوبکر - رضی اللہ عنہ- کے زمانۂ خلافت میں اور تیسری بار حضرت عثمان غنی -رضی اللہ عنہ- کے عہد خلافت میں۔

تدوین قرآن عہد رسالت میں

اگر قرآن کی تبویب کا جائزہ لیتے ہوئے عہد نبوی پر طائرانہ نظر ڈالیں تو اس کی جھلکیاں وہاں بھی نظر آتی ہیں۔ جب قرآن کی حفاظت کے سلسلے میں آپ - صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم- کو خدشہ ہوتا تھا کہ مبادا قرآن کریم کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔خود اس کی تسلی باری تعالی نے دی کہ سنقرئك فلا تنسی(۸) اور ان علینا جمعه و قرآنه --------- البیانه ۔ (۹) مولانا حمید الدین فراہی رقمطراز ہیں کہ قرآن کریم کی ترتیب وتدوین حکم الٰہی سے عہد رسالت میں ہوئی۔ اور اللہ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ کبھی اجمالاً اور کبھی تفصیلاً متعدد آیات میں فرمایا ہے۔ وانه لکتاب عزیز لایاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه ۔ إنا نحن نزلنا الذکروانا له لحافظون(۱۰) ایک تو یہ کتاب ہے جو ابھی سنائی جارہی ہے۔گویا خوشخبری ہے کہ اس کی شکل ایک کتاب کی سی ہوگی۔اس کے سارے احکام میرے ہیں۔جس میں کسی قسم کا ردو بدل کبھی نہ کیا جاسکے گا۔سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں؟ یقیناً یہ اس لیے کہ اس ذکر (کتاب) کے ہم ہی حافظ ونگہبان ہیں۔تمت کلمة ربك صدقا وعدلا ۔قرآن کی حفاظت کے لئے من جانب اللہ مکمل انصرام ہوا ہے ۔ اس کی جمع و تبویب کا کام بھی زمانہ نبوت میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہاں تک کہ خود آپ- صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم- بقول علامہ سیوطی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو پورا قرآن بالترتیب رمضان المبارک کے

مہینے میں سناتے تھے۔اور جس سال آپ - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم- کی وفات ہوئی اس سال آپ - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم- نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل کے ساتھ دور کیا۔ (۱۱) عہد رسالت میں قرآن کے لکھنے کا سلسلہ تھا۔کاتبین وحی کی تعداد چالیس تک شمار کی گئی ہے۔کوئی وحی آتی تو آپ اسے لکھواتے تھے۔اللہ رب العزت نے آسمانی دیگر صحیفوں پر قرآن کو امتیاز یوں عطا فرمایا کہ اس کی حفاظت سینوں میں کرائی ہے۔حدیث قدسی میں اللہ فرماتا ہے۔ و منزل علیك كتابا لایغسله الماء (۱۲)

عہد نبوی میں قرآن اشیائے متفرقہ میں لکھا ہوا تھا۔بقول علاءالدین علیؒ: انما القرآن كان على هذا التاليف و الجمع فی زمن الرسول و انما ترك جمعه فی مصحف واحد ۔(۱۳) عہدرسالت میں کتابت کے ساتھ جمع وترتیب کا کام ہوا۔حضرت عثمان غنیؓ راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم- کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبِ وحی کو ہدایت فرماتے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے ۔ یاد رہے کہ حضرت عثمانؓ خود بھی ایک کاتب وحی ہیں۔میرا خیال ہے کہ اس طرح حفاظت کا بھرپور انتظام کیا گیا۔(۱۴)

عہد صدیقی میں قرآن کی تدوین

نبی اکرم - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم- کی وفات کے بعد عہد صدیقی میں ارتداد کی مسموم ہوا چلی۔ڈھکے چھپے انداز میں بغاوت کرنے والے اور جھوٹے نبوت کے دعویدار کھل کر میدان میں آ گئے۔باغیوں اور سرکشوں کا قلع قمع کرنا ایسے میں امر لازم تھا۔امام المسلمین حضرت ابوبکر صدیقؓ نے" اینقص الدین و انا حی " کا تاریخ ساز جملہ کہا۔اس کا نعرہ لگا کر حرارت ایمانی کا لازوال ثبوت دیا۔قرآن کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کی اس وقت سے موجودہ وقت تک اسی طرح پرزور مخالفت کی جاتی رہی۔ یہ سنت صدیقی تا قیامت زندہ رہے گی۔حضرت ابوبکر کے ساتھ صحابہ کرام میدانِ جہاد میں کود پڑے ۔اس میں بہت سے حفاظِ صحابہ کرام شہید ہو گئے ۔حضرت عمر فاروقؓ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر قرآن مجید کے تحفظ پر حکومت نے توجہ نہ کی تو پھر قرآن کے لئے بھی وہی دشواری پیش آئے گی جو پرانے انبیا کی کتابوں کے سلسلے میں پیش آئی تھی۔(۱۵) باتفاق مؤرخین ایمائے عمرؓ پر حضرت ابوبکرؓ نے شہر میں منادی کرادی۔علامہ حجر عسقلانی - رحمۃ اللہ علیہ - کی عبارت ملاحظہ ہو۔

قام عمرؓ، فقال من كان تلقى من رسول الله شيئامن القرآن الكريم ،فليات به و كانوا يكتبون ذلك فی الصحف و الالواح و العسب قال و كان لا يقبل من احد شيئا حتى يشهد شاهدان۔(۱۶)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین محفوظ چیزیں لے لے کر آئے اور حفاظت کے لئے حضرت زید بن ثابت کی سرکردگی میں مصحف تیار کروایا۔مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی اپنی کتاب علوم قرآن میں لکھتے ہیں،عبارت ملاحظہ ہو:

حضرت زید بن ثابت نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآن کو جمع کر کے انھیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا؛لیکن ہر سورۃ علاحدہ علاحدہ صحیفے میں لکھی گئی۔اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں میں مشتمل تھا۔(۱۷)

ماضی قریب کے معروف محقق اور عالم ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب 'خطبات بہاولپور' کی عبارت اسی ضمن میں پڑھتے جایئے، وہ لکھتے ہیں کہ جس کمال احتیاط سے قرآن مجید کی تدوین عمل میں آئی اس کا مقابلہ تاریخ عالم کی دینی کتابوں میں سے کوئی کتاب نہیں کرسکتی۔(۱۸)

حضرت ابوبکرؓ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے قرآن

مجید کی ترتیب وتبویب کو یکجا کیا۔حضرت علیؓ نے فرمایا۔ اعظم الناس فی المصاحف اجراً ابو بکر رحمة الله علی ابی بکر هو اول من جمع کتاب الله (۱۹)

عہد عثمانی میں قرآن پر اجماع

قرآن ایک جگہ جمع ہوا۔ پھر خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا۔ ہر جہار جانب اسلام کا غلغلہ بلند تھا۔حضرت عمرؓ کی وفات کے حادثۂ فاجعہ کے بعد حضرت عثمان خلیفہ منتخب ہوئے۔ کچھ بد باطن جن کا ضمیر روشن نہ ہوا تھا، وہ اسلام و قرآن کو نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ خیر القرون میں اہل اسلام کی مضبوط صفیں تھیں۔ان کا ہر روز نیا قدم تازہ ایمان کے ساتھ اٹھتا تھا۔ بلاد وشہور اور مدن وقریٰ ایک جھنڈے تلے جمع ہوتے۔قرآن کریم کی تعلیم کے لئے صحابہ مأمور تھے۔ابھی قرن اول ہی ہے کہ قرأت کے اختلافات شروع ہوئے۔ سنگین غلطی کا خطرہ پیدا ہوگیا۔حضرت عثمانؓ اس الجھن کے حل کی جستجو میں تھے۔ یک بیک اس عظیم کارنامے کے لئے حضرت عثمانؓ آمادہ ہوگئے۔تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ خلافت عثمانی میں جنگ آرمینیا پیش آئی۔مسلمانوں میں باہم اختلاف قرأت کی جھڑپ ہوئی۔وہاں پر مسلمانوں میں اسی مسئلہ پر بڑا تنازع پیدا ہوگیا۔علامہ شمس الحق افغانی تحریر کرتے ہیں کہ خود مدینہ میں معلموں اور متعلموں میں اختلاف قرأت کا فتنہ پیدا ہونے لگا۔(۲۰) حضرت عثمان غنیؓ نے خطبہ دیا۔انتم عندی تختلفون فمن نأی من الامصار اشد اختلافا (۲۱)

جنگ سے واپسی کے بعد کمانڈر انچیف حذیفہ بن یمانؓ سیدھے خلیفہ کے پاس پہنچے۔ پیش آمدہ واقعہ سے روشناس کرایا، تو فوراً آپؓ نے اس طرف دھیان دیا اور عہد صدیقی کا تیار شدہ نسخہ قرآن منگوا کر ایک قرأت پر جمع کیا۔ پھر کئی نسخے تیار کروا کر مختلف شہروں میں بھجوا دیئے، جو فی الوقت رائج ہیں۔ وفی هذه المرة الأخيرة وحدها نسخت المصاحف و أُرسلت الى الآفاق (۲۲)

از منہ ثلاثہ میں قرآن کریم کی تدوین کے مقاصد

المختصر یہ کہ عہد نبوی میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا تھا۔اس لئے قرآن کو مختلف اشیا پر تحریر کیا گیا۔عہد صدیقی میں جمع قرآن سے یہ مقصد تھا کہ قرآن کو یکجا کتابی صورت میں جمع کیا جائے، تاکہ متفرق قطعات میں سے کسی قطعہ کے ضائع ہونے کا خطرہ باقی نہ رہے۔عہد عثمانی میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کو اختلاف تلفظ وغیرہ سے محفوظ رکھنا تھا تاکہ فتنہ پیدا نہ ہو۔ یقیناً اس کے بعد کسی بھی طرح سے ضیاع قرآن کا خطرہ دل سے نکل گیا۔مصاحف عثمانی کی نقول وسیع پیمانے پر شائع کرائی گئیں، جن کی آج تک ہر طریقے پر اتباع کی جاتی ہے۔(۲۳)

حواشی

(۱) قرآن کریم (۲) آسماں بار امانت نہ تواند نہ کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدن (۳) نظام القرآن ص ۲۱۲ (۴) علوم فی القرآن تحقیقی مقالات۔ص ۳۳۴ (۵) دیباچہ،علوم فی القرآن (۶) المستدرک للحاکم ص ۲۲۹ ج ۲ (۷) مناھل العرفان ص ۱۳۸ ج ۱ (۸) قرآن (۹) ایضا (۱۰) نظام القرآن ص ۲۱۳ (۱۱) الاتقان ص ۲۵۰ ج ۱ (۱۲) صحیح مسلم (۱۳) تفسیر خازن ص ۷۵ (۱۴) فتح الباری ص ۱۸ ج ۹ (۱۵) خطبات بہاول پور ص ۳۲ (۱۶) فتح الباری ص ۱۲۴ ج ۱ (۱۷) علوم القرآن (۱۸) خطبات بہاول پور ص ۳۴ (۱۹) مناھل العرفان ص ۲۵۰ ج ۱ (۲۰) علوم القرآن (۲۱) الاتقان ص ۵۹ ج ۱ (۲۲) ایضا ص ۱۳۸ ج ۱ (۲۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں جمع قرآن ص ۶۷ تا ۷۵ اور تاریخ قرآن۔

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

احسان شناسی؛ ایک اعلیٰ انسانی صفت

عبدالرشید طلحہ نعمانی

معروف اسلامی مورخ علامہ عبد الرحمٰن ابن خلدون اپنی کتاب ''تاریخ ابن خلدون'' کے مقدمے میں ارقام فرماتے ہیں کہ ''اجتماع'' انسانی ضرورت ہے یعنی آدمی کا اپنے ابنائے جنس کے ساتھ مل جل کر رہنا ایسا لابدی امر ہے جس سے راہ فرار اختیار نہیں کی جاسکتی۔ مدنیت انسانی فطرت میں شامل ہے اور ہر انسان اپنی ضروریات زندگی کے لیے دیگر انسانوں کے تعاون کا محتاج اور معاشرتی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ جب یہ حقیقت ہے کہ بنی آدم کسی نہ کسی اعتبار سے ایک دوسرے کے محسن ومعاون ہیں تو اس احسان کا تقاضا ہے کہ اپنے محسن کے ساتھ وفاداری اور احسان شناسی کا معاملہ کیا جائے، اس کے تعاون کا اچھا بدلہ دیا جائے، اگر بدلے میں کوئی مادی چیز دینے کی استطاعت نہ ہو تو خلوص دل کے ساتھ دعائے خیر دی جائے اور اپنے قول وعمل سے ہرگز اس طرح ظاہر نہ کیا جائے جس سے احسان فراموشی کی بو آتی ہو۔

احسان شناسی کی ضد احسان فراموشی ہے، جو ان دنوں جنس ارزاں کی طرح عام ہوتی جارہی ہے۔ آج کے انسان کا معاملہ نہ صرف محسن انسانوں کے ساتھ؛ بل کہ خود منعم حقیقی کے ساتھ اس درجہ احسان فراموشی کا ہے کہ وہ اس کی عطا کردہ زندگی جیسی عظیم نعمت اور مزید لاتعداد نعمتوں اور رحمتوں کے باوجود بھی کفران نعمت اور ناشکری جیسی انتہا سے باز نہیں آتا اور نتیجتاً قانون قدرت کے مطابق عذاب الٰہی کا مستحق قرار پاتا ہے۔ احسان فراموشی کی صفت جس انسان میں پائی جاتی ہے، وہ دنیا میں اپنی جانب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی بیش بہا نعمتوں کے دروازے بند کرلیتا ہے اور روز قیامت عتاب خداوندی کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔

احسان شناسی؛ کتاب وسنت کی روشنی میں:

ہم پر احسان خواہ والدین کا ہو یا کسی بھی دوسرے انسان کا، شریعتِ مطہرہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم احسان شناسی کا ثبوت دیں۔ صاحبِ استطاعت ہونے کے بعد ہمارا فریضہ ہے کہ اپنے والدین اور اساتذہ کا خیال رکھیں، ان کی ضروریات پوری کریں، ان کو ہر قسم کی راحت وآسائش پہنچانے کی فکر کریں، جیسا کہ وہ ہمارے بچپن میں ہماری فکر کرتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تم آپس میں ایک دوسرے کے احسان کو مت بھولو، بے شک اللہ کو تمھارے اعمال کی خبر ہے''۔ (البقرہ:237) دوسری جگہ

اپنی نعمتوں کو یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے: ''اگر تم اس کا شکر ادا کرو گے، تو وہ تم سے راضی ہوگا''۔ (الزمر:7)

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ بلقیس کے واقعے کے ضمن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبانی ارشاد ہوا: ''وہ (جن) جس کے پاس کتاب کا علم تھا، اس نے کہا کہ میں (ملکۂ بلقیس کے تخت کو) آپ کے پاس پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا، تو جب حضرت سلیمان نے اس عرش کو اپنے پاس دیکھا تو کہا یہ میرے رب کا احسان اور فضل ہے، جو مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں اس کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں۔ بے شک جس نے شکر یہ ادا کیا، اس نے اپنے لیے کیا اور جس نے کفرانِ نعمت کیا، تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور کرم فرما ہے''۔ (النمل:40)

اسی طرح سورۂ رحمان میں مقربین کی جنت و نعمت کے اوصاف بیان کرنے کے بعد آخر میں مخاطبین کو متوجہ کر کے نہایت بلیغ بات ارشاد فرمائی: ھل جزاء الإحسان إلا الإحسان۔ (الرحمٰن:60) تمہیں اس بات پر تعجب کیوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو یہ ساری نعمتیں دینے والا ہے! آخر نیکی اور پاک بازی کا بدلہ کیا ہونا چاہیے؟ انعام و اکرام ہی ہونا چاہیے یا کچھ اور؟ ظاہر ہے کہ جس بندہ نے بندہ ہو کر بندگی کے حقوق کو بہ حسن وخوبی پورا کیا، کیا رب ذوالجلال والاکرام پروردگار عالم ہو کر اپنی شان بندہ نوازی میں کوئی کمی رہنے دے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں!! اللہ تعالیٰ تو ہر ایک انسان کو اس کے احسان کا اچھا بدلہ دینے والا ہے وہ تو کسی کی نیکی کو رائیگاں نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا اجر دینے میں کبھی بخل سے کام لے گا۔ یہ بات چونکہ انسانی فطرت میں راسخ ہے، کوئی عاقل، سلامتیٔ عقل و ہوش کے ساتھ اس کا انکار نہیں کر سکتا، اس وجہ سے بات ایسے اسلوب میں بیان فرمائی، جو ایک واضح حقیقت ہے یعنی احسان کا بدلہ بجز احسان کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ لفظ احسان نیکی کے معنی میں بھی آتا ہے اور نیک صلہ کے معنی میں بھی، اس آیت میں یہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

احادیث مبارکہ میں بھی نبی پاک ﷺ نے قدم قدم پر احسان شناسی کی تعلیم دی ہے اور محسن کی قدر شناسی کو ضروری بتلایا ہے، اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابو ہریرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص انسانوں کا شکر نہیں ادا کرتا، وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتا۔ (جامع ترمذی)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کی ناشکری کے حوالے سے ارشاد فرمایا: مجھے دوزخ دکھلائی گئی تو اس میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو کفر کرتی ہیں۔ کہا گیا یا رسول اللہ! کیا وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خاوند کی ناشکری کرتی ہیں۔ اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ اگر تم عمر بھر ان میں سے کسی کے ساتھ احسان کرتے رہو۔ پھر تمہاری طرف سے کبھی کوئی ان کے خیال میں ناگواری کی بات ہو جائے تو فوراً کہہ اٹھیں گی کہ میں نے کبھی بھی تم سے کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔ ایک اور حدیث میں اپنی امت کو انسانی ہم دردی اور حسن سلوک کی تلقین کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص تم سے اللہ کے واسطے سے پناہ مانگے، اسے پناہ دے دو، جو اللہ کے واسطے سے مانگے، اسے دے دو، جو تم سے

فریاد کرے، اس کی مدد کرو، جو تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کرے، اسے اس کا بدلہ دو اور اگر تمہارے پاس اسے بدلہ دینے کے لیے کچھ نہ ہو، تو اس کے لیے اتنی دعائیں کرو کہ تمھیں لگنے لگے کہ تم نے اس کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے''۔ (سنن ابوداؤد)

محسن انسانیت ﷺ کی احسان شناسی:

نبی پاک ﷺ نے اپنی زبانِ حق شناس سے احسان شناسی کا نہ صرف درس دیا؛ بل کہ اپنے عمل اور کردار کے ذریعہ بھی اس کی اہمیت کو موقع بہ موقع اجاگر کیا۔ اس حوالے سے چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک شخص کا ایک خاص عمر کا اونٹ قرض تھا۔ وہ شخص تقاضا کرنے آیا تو آپ نے (اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے) فرمایا کہ ادا کردو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس عمر کا اونٹ تلاش کیا؛ لیکن نہیں ملا۔ البتہ اس سے زیادہ عمر کا مل گیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہی انہیں دے دو۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ آپ نے مجھے پورا پورا حق دے دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی پورا بدلہ دے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض وغیرہ کو پوری طرح ادا کردیتے ہیں۔ (بخاری شریف)

۲۔ حضور پاک ﷺ جب طائف سے زخمی حالت میں واپس پلٹے تو آپ مکہ سے باہر رک گئے کہ قریش جو پہلے ہی دشمن تھے، نہ جانے ان کا کیا ردعمل ہوگا۔ جب مکہ میں اطلاع پہنچی تو سرداران مکہ میں سے ایک مشرک سردار مطعم بن عدی نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ وہ ہتھیار بند ہوجائیں اور جا کر محمد (ﷺ) کو اپنی امان میں لے کر گھر پہنچائیں۔ جب وہ آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے ان کے باپ کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ میرے لیے اللہ ہی کی امان کافی ہے۔ نبی پاکؐ نے اس سردار کی یہ نیکی زندگی بھر یاد رکھی۔ جنگِ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپؐ نے فرمایا: ''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور مجھ سے ان قیدیوں کی رہائی کی بات کرتا تو میں ان سب کو بلا معاوضہ رہا کردیتا۔ اسی طرح آپؐ نے فتح مکہ کے بعد ایک موقع پر جبیر بن مطعمؓ کو اونٹوں سے بھری ہوئی ایک پوری وادی بخش دی۔ (بخاری شریف/ اسد الغابۃ)

۳۔ خلیفۂ اول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار اور یارِ مزار ہیں، آپ علیہ السلام ان کے احسانات کا بارہا تذکرہ فرماتے اور یوں کہتے: کسی کا بھی ہمارے اوپر کوئی ایسا احسان نہیں جس کا ہم نے بدلہ چکا نہ دیا ہو، سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے۔ بے شک اُن کے ہمارے اوپر احسانات ہیں جن کا بدلہ اللہ رب العزت قیامت کے دن چُکائے گا۔ (ترمذی شریف)

فساد و بگاڑ کا اصل سبب:

اس وقت مجموعی طور پر دنیا میں جو فساد اور اختلاف برپا ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں؛ جن میں ایک وجہ احسان شناسی کا فقدان ہے۔ اگر احسان شناسی طبیعت ثانیہ بن جائے تو پھر نہ خانگی زندگی میں کوئی اختلاف ہو، نہ ادارہ جاتی سطح پر کوئی فساد؛ بل کہ خاوند اپنی بیوی کا احسان شناس ہو اور بیوی اپنے خاوند کی، حاکم اپنے محکوم کا منت شناس ہو اور محکوم اپنے حاکم کا۔ اس طرح امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر ہو اور کبھی ناچاقی کی نوبت ہی نہ آئے؛ مگر افسوس کہ آج مسلم سماج

میں احسان شناسی کی جگہ احسان فراموشی نے لے لی اور ہرسمت اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔شاید اسی لیے اہل عرب کے ہاں مثل مشہور ہے: اِتَّقِ شَرَّ مَنْ اَحْسَنْتَ اِلَیْهِ یعنی جس پرتم نے احسان کیا ہواس کے شر سے بچتے رہو۔خدا جانے کس زمانے میں کہنے والوں نے یہ بات کہی ہواور کس پس منظر میں کہی ہو؛مگر آج کل تو ہرجگہ یہی صورت حال ہے۔ حضرت تھانویؒ کے بہ قول:اس زمانے میں دوستی اور محبت اکثر اغراض کے لیے ہوتی ہے جب تک غرض پوری ہوتی رہی، دوست ہیں اور جس دن اغراض میں کمی آئی اس دن سے دشمن ہیں، چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ جن لوگوں پر پورا اعتماد تھا کہ یہ دوستی سے کبھی نہ بدلیں گے، وہ بھی اپنے اغراض میں کسی وقت نقصان دیکھ کر بالکل بدل گئے، اور ایسے بدلے کہ دشمن سے بھی بدتر دشمن بن گئے۔ (التبلیغ وعظ تقلیل الطعام)

اخیر میں احسان شناسی کے تئیں حضرت مولانا اسرارالحق قاسمی علیہ الرحمۃ کی تحریر سے ایک اہم اقتباس پیش کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتے ہیں،حضرت مولانا ارقام فرماتے ہیں: اسوۂ نبوی سے ہمیں یہ ہدایت ملتی ہے کہ محسن کے احسان کا شکر ادا کرنا، صاحبِ فضل کا اعتراف کرنا اور احسان کا بدلہ احسان کے ذریعے دینا مسلمانوں کا وطیرہ ہونا چاہیے اور سب سے زیادہ ہمیں جن لوگوں کے احسانات کی قدر کرنی چاہیے، وہ ہمارے ماں باپ ہیں، کیوں کہ ہم چاہے جس قدر بھی ان کے حقوق ادا کردیں، پورے طور پر اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے، اسی طرح ہمیں اپنے اساتذہ اور ہماری پرورش و پرداخت میں حصہ لینے والوں کی بھی قدر کرنی چاہیے اور ان کے احسانات کا اعتراف کرنا چاہیے، اسی طرح شوہر و بیوی کو بھی ایک دوسرے کا احسان شناس رہنا چاہیے اور اگر اتفاقاً طلاق اور باہم قطعِ تعلق کی نوبت آجائے، تو بھی ایک دوسرے کا قدردان رہنا چاہیے۔اسی طرح زندگی کے کسی بھی موڑ پر کسی بھی شخص کے ذریعے ہمیں کسی قسم کی مدد یا ہم دردی حاصل ہو تو ہمیں وہ یاد رکھنا چاہیے۔آج کل لوگ اپنے خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو یاد نہیں رکھتے تو بندوں کے احسانات کہاں یاد رکھیں گے؟! چناں چہ احسان فراموشی کی وبا ہر سطح پر ہمارے معاشرے میں عام ہے اور اس کی وجہ سے بھی بہت سی معاشرتی خرابیاں جنم لے رہی ہیں۔سب سے پہلے تو ہمیں اپنے اوپر ہر لمحہ نازل ہونے والی اللہ کی نعمتوں کا استحضار ہونا چاہیے، اس کے حقوق اور احکام بجالانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے بعد جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں وہاں جو ہمارے محسنین اور کرم فرما ہیں، ان کے تئیں احسان شناسی کا ثبوت دیں، احسان کرنے والے کا احسان جتلانا ایک مذموم عمل ہے، لیکن جس پر احسان کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ ضرورت پڑنے پر اپنے محسن کا قرضہ اتارنے کی کوشش کرے اور اگر استطاعت نہ ہو تو کم از کم اس کے لیے دعائیں کرے۔(ماہ نامہ الفاروق، ربیع الثانی 1438ھ)

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

گھر میں دینی نشست کی ابتدا کیسے کی جائے؟

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

کسی بھی گھر میں یہ مجلس کسی بھی وقت کو متعین کر کے شروع کی جاسکتی ہے، خواہ اس گھر میں ایک ہی بچہ کیوں نہ ہو، اس مجلس میں بچوں کے سامنے کسی فکر کی تشریح کی جائے اور ان کے ساتھ مذاکرہ کیا جائے، عام طور پر بچے فکر وخیال کے تئیں پر جوش ہوتے ہیں، لیکن بعض بچے اس معاملہ کی حقیقت کے سلسلہ میں والدین کی نیت پر شک یا علامت شک ظاہر کرتے ہیں، لیکن بہرحال وہ سب موضوع کو جاننے اور تجربہ کرنے پر متفق ہو جاتے ہیں، اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ اول مرحلہ میں اس مجلس میں جو بات کرنا چاہیں اس پر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، تا کہ ان کو یہ محسوس ہو کہ یہ مجلس تو والدین سے اپنے من کی بات کرنے کا بڑا سنہرا موقع ہوتی ہے، پھر اگر والدین بچوں کے شوق و مزاج کے مطابق موضوعات پر گفتگو کریں تو یہ اور بہتر ہوگا، مثلاً سیر وتفریح اور پکنک پر بات شروع کر دیں، عید کے تحائف خریدنے یا گرمی کی چھٹیاں گذارنے سے متعلق بات شروع کر دیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی کو رغبت نہ ہو تو اسے قطعاً شرکت پر مجبور نہ کیا جائے، حتی کہ اگر والدین میں سے کوئی نہ آنا چاہے تو اس کو بھی مجبور نہ کیا جائے، البتہ اس کو حکمت واحترام کے ساتھ آگاہ کر دیا جائے کہ اس مجلس میں کس موضوع پر گفتگو ہونے والی ہے، پھر جو فیصلے اس سے یا دوسروں سے متعلق لیے جائیں ان سے بھی آگاہ کر دیا جائے، مثلاً بتا دیا جائے گھر کے کام کس کے لیے کیا طے ہوئے ہیں، اسکول کی چھٹیوں سے متعلق کیا ترتیب بنی ہے، اغلب یہی ہے کہ میٹنگ میں سبھی شریک ہوں گے خواہ کوئی دیر ہی سے کیوں نہ آئے۔

چھوٹے بچے حتی کہ ۴/سال کی عمر کے بھی ان مجلسوں میں شریک ہو سکتے ہیں، مگر یاد رہے کہ اگر چھوٹے بچے شامل ہوں تو ان کا دورانیہ کم ہونا چاہیے، مثلاً دورانیہ ۲۰/منٹ کا ہو اور ایک مجلس میں ایک ہی موضوع کے مذاکرے پر اکتفا کر لی جائے۔

جن کے بچے چھوٹے ہوں ان کو کچھ وقت خاص کرنا چاہیے، پھر اس خاص وقت میں تمام افراد خانہ بیٹھیں، قصے کہانیوں کا دور چلے، واقعات و حکایات پڑھی جائیں، یا کوئی اجتماعی کھیل کھیلا جائے، اس طرح کسی بھی فیملی کے لیے بالواسطہ امور پر گفتگو ممکن ہوگی، بچے ان

مجلسوں کی پاکیزہ اور محبت آمیز یادیں تا عمر محفوظ رکھیں گے، عنقریب سبھی ساتھ گذارے ہوئے ان لمحات کے فائدے محسوس کریں گے، آئندہ دنوں میں جب بچے اچھی طرح بڑے ہو جائیں گے اس وقت اس طرح کی نشستوں کے لیے ابھی سے اچھی راہ ہموار ہوگی۔

مثالیں اور عملی مواقف:

پہلے والدین فیصلے لیا کرتے تھے اور بچوں کے ذمہ صرف ان فیصلوں کو نافذ کرنا اور ان پر عمل کرنا ہوتا تھا، لیکن اب ہم سنتے ہیں کہ اکثر خاندانوں میں معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے، اس سلسلہ میں آپ کی اپنی کیا رائے ہے؟

ان دنوں عام خاندانوں میں فیصلے لینے کا اختیار کس کو ہے؟ والدین، بچے یا پھر دونوں کو؟ مثلاً اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

بچے اپنے اوقات کیسے گزاریں گے؟
کون سا ٹی وی سیریل دیکھیں گے؟
افراد خانہ کے درمیان گھر کے کاموں کی تقسیم کیسے ہوگی؟

وہ کون سے اہم فیصلے ہیں جن کی خاندانی زندگی میں اہمیت ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ فیصلے کون لے گا؟

آپ کی رائے میں کس کے لیے فیصلے لینا ضروری ہے؟

اب آپ سوچیے کہ ایک آدمی کس طرح مرتب خاندانی مشاورتی نشست شروع کر سکتا ہے؟
کون سا دن اس میٹنگ کے لیے بہتر ہوگا؟
کون سا وقت مناسب رہے گا؟

آپ اس خیال کی طرف بچوں کو لبھانے کے لیے ان سے کیا کہہ سکتے ہیں؟

اب ہم یہاں آپ کے سامنے وہ گفتگو پیش کرتے ہیں جو ایک خاندان کی ہفتہ واری نشست میں ہوئی، آپ اس مذاکرے میں ان اہم امور کو سمجھنے کی کوشش کیجیے جن کا ہم نے ذکر کیا، جیسے حوصلہ افزائی، اچھی طرح سننا، مشکلات کے حل کے چار مراحل وغیرہ۔

والد: اچھا بھائی! دیکھیے ہماری گزشتہ ملاقات کو ایک ہفتہ گذر گیا، ہمیں یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ بہت سے معاملات میں واضح طور پر بہتری آئی ہے، یہ بہت اچھی بات ہے کہ ہم میں سے جب کوئی کھانا کھا لیتا ہے تو اس کو یاد نہیں دلانا پڑتا کہ کھانے کے بعد دسترخوان صاف کرنا ہے اور اسے تہہ کرنا ہے، ہم نے گزشتہ ہفتہ گھر کے کاموں کی تقسیم سے متعلق جو فیصلے لیے تھے وہ سبھی کے لیے مفید تھے، آپ لوگوں کی کیا رائے ہے اس سلسلے میں؟ کیا ہم سب گزشتہ ہفتے کے فیصلوں پر اطمینان (Satisfaction) محسوس کرتے ہیں؟

سعد: نہیں میں مطمئن نہیں، بعض لوگ اپنی پلیٹ اور چمچہ بھی کھانے کے بعد دسترخوان پر چھوڑ دیتے ہیں، نائلہ تو کھانا ختم کرنے میں بہت دیر لگاتی ہے، میں پلیٹ دھو بھی لیتا ہوں مگر اس کا کھانا نہیں ختم ہوتا۔

ماں: سعد یہ بات صحیح ہے، ہم نے بھی یہ محسوس کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے تمہارا کام مشکل ہوتا ہے۔

والد: اچھا تو اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کیا تجاویز ہیں؟

سعد: ایک حل یہ ہے کہ نائلہ بھی سب کے ساتھ ہی کھانا ختم کرے۔

نائلہ: ذرا رکیے، یہ انصاف نہیں ہے، میں دراصل اسکول سے ہی لیٹ آتی ہوں، اس لیے ذرا دیر سے کھانا شروع کرتی ہوں۔

والد: بہتر ہے، سعد نے ایک حل پیش کیا ہے، کیا اس پریشانی کو حل کرنے کی کوئی اور تجویز ہے؟ (یہ کہہ کر والد ذرا دیر کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں اور سب کو سوچنے کا موقع دیتے ہیں)

سعد: جو اپنی پلیٹ چھوڑے وہ خود ہی لے جا کر دھوئے۔

نائلہ: لیکن یہ تو پیچیدہ معاملہ ہوگا، یہ تو جب تک ہم آپس میں استفسار نہ کریں پتہ کیسے چلے گا کس نے پلیٹ چھوڑی اور کس نے نہیں چھوڑی، میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ دسترخوان صاف کرنے کی پوری ذمہ داری ایک ہی آدمی پر ہونی چاہیے۔

والد: چلیے اب ہمارے سامنے یہ تین تجاویز ہیں، پہلی یہ کہ نائلہ کھانا سب کے ساتھ ختم کرے، دوسری یہ کہ جو تاخیر کرے وہ اپنی پلیٹ خود دھوئے، تیسری یہ کہ دسترخوان کی ترتیب وصفائی ایک ہی شخص کے ذمہ ہو، کیا کوئی اور تجویز ہے؟ (خاموش ہو گئے) پھر بولے کہ نائلہ کو پہلی اور دوسری تجویز پر اعتراض ہے تو آپ لوگوں کی کیا رائے ہے تیسری تجویز قبول کر لی جائے کہ دسترخوان کی پوری ذمہ داری ایک ہی شخص کے ذمہ ہو؟

سعد: لیکن وہ کون ہوگا جو یہ ذمہ داری نبھائے گا؟

نائلہ: اگر میں برتن دھونے کی ذمہ داری لے لوں تو پھر کسی کو تاخیر کا شکوہ نہ ہوگا، تو کیوں نہ ہم ذمہ داری تبدیل کر لیں۔

والد: سعد کیا رائے ہے؟ تم برتن دھونے کی ذمہ داری نائلہ کو دے دو، اس کے بدلہ برتن باورچی خانہ تک پہنچانے اور دسترخوان تہہ کرنے کی ذمہ داری تم لے لو۔

سعد: ٹھیک ہے میں متفق ہوں۔

والد: بہتر ہے، پھر یہی طے پایا، اب ہم دیکھیں گے کہ آئندہ ایک ہفتہ تک معاملات کیسے چلتے ہیں، آئندہ نشست میں پھر جائزہ لیا جائے گا، اس طرح اب ہم اس موضوع کو ختم کرتے ہیں جس پر آج ہم لوگ بات کرنا چاہتے تھے۔

نائلہ: اماں نے آج سونے کے وقت پر بھی گفتگو کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

ماں: ہاں! صحیح بات ہے، بچوں کے سونے کے وقت سے میں مطمئن نہیں ہوں، ہم نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ سعد کو ۹/ بجے سونا ہے اور نائلہ کو ۸/ بجے، لیکن دونوں روزانہ اس مقرر وقت سے غفلت برتتے ہیں۔

سعد: لیکن اماں یہ ۹/ بجے سونا میرے لیے بہت جلدی ہے، میں بغیر خبروں کی نشریات دیکھے سونے نہیں جا سکتا۔

نائلہ: ہاں! اماں میری کلاس کی بہت سی لڑکیاں ۱۲/ بجے سے پہلے نہیں سوتی ہیں۔

ماں: دوسری بچیاں کیا کرتی ہیں میں اس پر بات نہیں کر رہی ہوں، میں تو بس وہ کہہ رہی ہوں جس پر ہم سب کا اتفاق ہوا تھا، آپ دونوں کے والد اور خود

مجھے شام کو کچھ وقت اور فرصت کے لمحات آرام کے لیے درکار ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں اس کا احترام کرو۔

والد: یہ بہت اہم معاملہ ہے، تمہاری والدہ اور خود مجھے سکون کے لیے کچھ وقت واقعی درکار ہے، تو اس مسئلہ کو ہم کیسے حل کریں؟

نائلہ: جب آپ دونوں کو سونا ہو، آرام کرنا ہو تو آپ لوگ اپنے کمرے میں جا سکتے ہیں، ہم کیوں اپنی آزادی سے محروم کیے جائیں؟

والد: یہ ایک تجویز ہوئی، اور کوئی دوسری تجویز؟

سعد: میں اس شرط پر وقت مقررہ پر اپنے کمرے چلا جاؤں گا کہ میں اپنے کمرے کی لائٹ نہیں بند کروں گا۔

والد: یہ دوسری تجویز ہوئی، اور کوئی رائے، (تھوڑی دیر خاموش ہوئے) پہلی تجویز کے بارے میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے، کہ ہم دونوں اپنے کمرے میں چلے جایا کریں۔

ماں: اس میں پریشانی ہوگی، تم دونوں جانتے ہو کہ بہت سے کام شام کو کیے جاتے ہیں، خطوط لکھنا، فون کرنا، آئندہ کل کے کاموں کی ترتیب بنانا وغیرہ تب ہی ہوسکتا ہے جب مجھے اور تمہارے والد کو شام کے وقت مکمل سکون حاصل ہو، تبھی ہم دونوں آپس میں بات کر کے یہ سارے امور انجام دے سکتے ہیں۔

والد: اور دوسری رائے کے بارے میں کیا خیال ہے کہ سعد و نائلہ دونوں اپنے کمرے کی لائٹ نہ بند کرنے کی شرط پر پابندی سے وقت پر اپنے کمرے چلے جائیں۔

ماں: لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم دونوں بستر پر جانے کے بعد بھی جاگتے رہو اور پھر صبح کم نیند کے سبب تھکے تھکے اٹھو۔

سعد: اماں ہم دونوں دودھ پیتے بچے تو نہیں ہیں۔

نائلہ: ہاں! اماں صحیح بات ہے ہم لوگ اب چھوٹے نہیں ہیں۔

ماں: ٹھیک ہے، اگر تم لوگ تھوڑی دیر جاگ لو تو مجھے کوئی حرج نہیں، لیکن صبح کو ہم میں سے کسی کو کم سونے یا تکان کے سبب کسی طرح کی بدمزاجی، بدسلوکی یا تاخیر کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

والد: یہ تجویز مناسب معلوم ہوتی ہے، تو تم لوگ تھوڑی دیر جاگنے اور صبح کو تکان نہ ہونے کے درمیان کس طرح تطبیق دو گے؟

سعد: اس طرح ممکن ہے کہ بستر پر جانے کے ایک گھنٹہ بعد ہم لائٹ بند کر دیں۔

ماں: ایک گھنٹہ ممکن نہیں! ہم کو پہلے نصف گھنٹہ کا تجربہ کرنا چاہیے۔

والد: میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم لوگ بغیر یاد دہانی کے لائٹ بند کرنے کی ذمہ داری نبھاؤ گے۔

نائلہ: میں خود لائٹ بند کروں گی۔

سعد: میں بھی۔

والد: یہ تم دونوں کا وعدہ ہے؟

سعد و نائلہ: جی جی بالکل۔

والد (اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ اس حل سے مطمئن ہیں؟

ماں: ہاں ٹھیک ہے میں بھی اس فیصلہ سے متفق ہوں، لیکن اگر بغیر یاد دہانی کے لائٹ نہ بند کی گئی تو کیا ہوگا؟

والد: بہتر ہے، اگر مناسب وقت پر بدون تذکیر لائٹ نہ بند ہوئی تو کیا ہوگا؟ اس سلسلہ میں کیا تجاویز ہیں؟ اس طرح اس خاندانی مشاورتی نشست میں آگے گفتگو جاری رہی۔

والدین کے لیے نصیحت:

جب گھر میں کسی کام کو شروع کرنے پر غور کیا جائے تو ہمیشہ ابتدا چھوٹے پیمانے سے کی جائے تاکہ

- معاملہ بتدریج آگے بڑھے، چنانچہ اگر گھر میں مشاورتی میٹنگ کے انعقاد کی ابتدا کی جارہی ہے تو بڑے پیمانے پر اور دیر تک کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، بہت لمبا چوڑا ایجنڈا (Shedule of work) نہیں ہونا چاہیے، ان نشستوں کی ابتدا بس اس پر ہونی چاہیے" کہ ہم میٹنگ کا تجربہ کریں اور دیکھیں کہ آنے والے ہفتوں میں امور کس طرح انجام پارہے ہیں، تجرباتی دور سے گذرنے کے بعد ان نشستوں کو مزید منظّم بھی کیا جاسکتا ہے اور ان کا دورانیہ بھی بڑھایا جاسکتا ہے اور ان کو مزید فعال بنایا جاسکتا ہے۔
- اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص کو ان نشستوں میں اگر رغبت نہ ہو تو نہ آنے کی آزادی ہونا چاہیے، اگر کبھی تمام ارکان خانہ مجلس میں حاضری سے منع کردیں تو پھر گھر کے معاملات کو دسترخوان پر طے (Discuss) کیا جاسکتا ہے، اگرچہ بہتر یہی ہوگا کہ باقاعدہ رسمی طور پر مجلس منعقد کرکے ہی امور طے کیے جائیں۔
- اس سلسلے میں یہ بات زیادہ معاون ہوگی کہ ابتدا میں مثبت حوصلہ افزائی سے مجلس کا آغاز کیا جائے، والدین نے جو مثبت پیش رفت دیکھی ہو اس کو حوصلہ افزائی سے مزید قوت فراہم کریں، ماں باپ دونوں مجلس کے دوران حوصلہ افزائی اور غور سے سننے پر خاص توجہ دیں، ساتھ ہی دیگر وسائل بھی استعمال کریں (جن کا ذکر پیچھے کیا گیا)، اپنے حقوق کے احترام کے لیے خاص اسلوب میں اپنے احساسات کا اظہار کریں، البتہ یہ لحاظ رکھیں کہ انشراح وسکون اور دلچسپی کا ماحول باقی رہے۔
- ہر نشست میں گزشتہ نشست کے فیصلوں کا جائزہ لیا جائے اور پھر ان کو لکھ لیا جائے، ان کو کہیں اس طرح چسپاں کردیا جائے کہ پورے ہفتہ سب لوگوں کی نظر پڑتی رہے، اس سے ان تجاویز اور فیصلوں کی پابندی کرنے میں مزید مدد ملے گی۔
- ان نشستوں میں مشکلات کا حل تلاشنے اور پریشانیوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے موضوعات پر گفتگو ہونا چاہیے جو دلچسپی اور لذت و لطف اندوزی کا باعث ہوں، جیسے سفر، تفریح اور پکنک کے لیے بات کی جائے۔
- ہر مرتبہ نشست کے اختتام پر والدین کو خود سے سوال کرنا چاہیے کہ نشست کیسی رہی، کون سے طریقے کامیابی کے ساتھ استعمال کیے گئے، کون سے امور ہیں جن کو آئندہ مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔
- چھوٹے بچے کے لیے ہفتہ میں ایک گھنٹہ بھی کھیلنے، گفتگو کرنے، اور والدین کے ساتھ وقت گذارنے

نیز تسلی حاصل کرنے کے لیے بہت مفید ہے، پھر رفتہ رفتہ اس گھنٹہ کو خاندانی مشاورتی نشست کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، پھر بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کھیل تفریح کے لیے الگ وقت باقی رکھا جائے خواہ اولاد سن بلوغ کے قریب پہنچ چکی ہو۔

- یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مشاورتی ملاقات بہت زیادہ رسمی نہ ہو، اس کی بہتر شکل وہ ہوگی جو افراد خانہ کی طبیعت سے میل کھاتی ہو، اہم بات بس یہ ہوگی کہ افراد خانہ ایک دوسرے سے ملیں گے، ہر ایک کو اپنی بات کا موقع حاصل ہوگا اور کوئی دوران کلام ان کی بات کاٹے گا بھی نہیں، ہر ایک کی آراء اور تجاویز کو اچھی طرح سنا جائے گا اور اس کا احترام کیا جائے گا۔
- یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس نشست میں تمام افراد خانہ موجود ہوں، کبھی کبھی صرف ایک بچے کے ساتھ بیٹھنا اور اس سے کسی خاص موضوع پر تبادلۂ خیال کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

بعض والدین کے تبصرے:

- سولہ سالہ عفاف کو نشست سے وہ نہیں حاصل ہوا جو وہ چاہتی تھی یعنی اس کی مرضی نہیں پوری ہوئی تو وہ غصہ ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی، میرا دل چاہا کہ کمرے سے باہر نکل کر عادت کے مطابق اس کو ڈانٹ دوں، لیکن ہم نے ایسا نہ کر کے میٹنگ جاری رکھی، جب اس کو لگا کہ میرے بغیر بھی میٹنگ جاری رہے گی اور مکمل ہوگی تو ۵/منٹ میں ہی واپس آ کر نئے سرے سے نشست میں شامل ہوگئی۔
- اس طرح کی نشستوں کا فائدہ مجھے معلوم ہے اور محسوس بھی ہوتا ہے، مگر ذاتی طور پر مجھے اس نشست میں سکریٹری اور مدیر جیسی اصطلاحات کے استعمال سے اتفاق نہیں یہ سب گھریلو مزاج کے ساتھ میل نہیں کھاتا، یہ تو کمپنی وغیرہ کی میٹنگوں میں ہونا چاہیے گھر کی نشست میں نہیں۔
- ہفتہ واری نشست کے سبب ہم ہر ہفتہ بچوں کے ساتھ بیٹھنے، بات کرنے اور ان کی باتیں سننے اور کچھ وقت ان کے ساتھ گذارنے پر مجبور ہوتے ہیں، اگر ان نشستوں کے فیصلوں سے قطع نظر صرف ساتھ بیٹھنے کو ہی دیکھا جائے تو یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔
- ہم نے اپنی اہلیہ کے ساتھ یہ طے کیا کہ بتدریج مشاورتی نشست کی ترتیب بنائیں، چنانچہ ہم نے کھانے پر بعض امور سے متعلق گفتگو کا آغاز کیا اور بچوں کو بتایا بھی نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں، اور پھر صورت یہ ہوگئی کہ اب ہم گفتگو کے لیے ہی کھانے پر بیٹھنے لگے، جبکہ پہلے کھانے کے وقت محض جلدی سے کھانا کھانا مقصود ہوا کرتا تھا، اب ہم لوگ پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں اور پُر شوق ہو کر مختلف موضوعات پر بچوں سے بات کرتے ہیں، جبکہ پہلے شاید ہی کبھی ہم پانچ افراد خانہ ایک ساتھ میز پر بیٹھا کرتے تھے، مرغوب و دلچسپ موضوعات میں مثلاً یہ موضوع ہوتا ہے کہ اس بار

عید میں کون کون کیا کیا خریدے گا، اس طرح اب ہمارے کھانے کا وقت تقریباً ایک گھنٹہ کا ہوگیا ہے، حالانکہ پہلے مجھے تعجب ہوتا تھا کہ بعض خاندان اتنی دیر تک کیسے کھانے پر بیٹھ جایا کرتے ہیں، لیکن اب سمجھ میں آیا کہ اس کا راز آپسی مذاکرہ اور دلچسپ موضوعات ہوتے ہیں۔

- میری بیٹی ابھی تین سال کی بھی نہیں ہوئی وہ مجلس میں نہیں شریک ہوسکتی، اس لیے ہم کوشش کرتے ہیں کہ اس کے لیے کھیل اور تفریح و گفتگو کے لیے کچھ وقت خاص کریں، اسی کھیل کھیل میں اس کی پریشانیوں اور خواہشات سے متعلق گفتگو کر لیتے ہیں، ہمیں اعتراف ہے کہ جب تک ہم نے یہ شروع نہیں کیا تھا تب تک ہم اس کی قدر و قیمت سے واقف نہیں تھے۔
- میرا خیال ہے کہ اولین میٹنگیں سب بیکار گئیں، اس لیے کہ کوئی تعاون نہیں کرنا چاہتا تھا، زیادہ تر نشستیں بغیر نتیجہ کے محض جھگڑوں پر ختم ہوجاتی تھیں، بات بن نہیں رہی تھی حتی کہ ہم نے مشکلات کے حل کے چاروں مراحل کا استعمال شروع کیا، بلاشبہ بچوں کو ایسے اصول وقواعد کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کی تفکیر ونشاطات میں رہنمائی کرسکیں، اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کو بغیر نظام وترتیب اور اصول کے نہ چھوڑا جائے ور نہ پھر معاملات پیچیدہ ہوں گے اور الجھنیں پیدا ہوں گی اور بے ترتیب و.....
- پہلے پہل تو میں اس خیال سے متفق نہیں تھا، مجھے لگتا تھا کہ یہ مشاورتی نشستیں صرف بچوں کی دلچسپی اور ان کے فائدے کے لیے ہیں، لیکن جب نشست ہوئی تو پتہ لگا کہ ہم میں سے کوئی بھی محروم نہیں رہا، اب میرا یقین ہے کہ یہ طریقہ کسی بھی پریشانی اور پیچیدگی کو حل کرنے کے لیے سب سے بہتر ہے، یہ طریقہ صرف فیملی کے لیے ہی مفید نہیں ہے بلکہ یہ مساجد، مدارس، کمپنیوں اور تنظیموں نیز زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں طور پر مفید ہے، اگر ہم ایک مامون و پرسکون اور انصاف پسند معاشرہ (Society) کی تشکیل چاہتے ہیں تو لازمی طور پر ہمیں مشاورتی نشست اور باہمی مذاکرہ کے طریقہ کو اپنانا پڑے گا۔

عامر نے کارڈ رائیونگ کا ٹسٹ پاس کرنے کے بعد یہ سوچا کہ اب اس کے بعد وہ جب چاہے والد کی گاڑی لے جاسکتا ہے، لیکن جب ہم گھر کی میٹنگ میں بیٹھے اور ہم نے اس سے صاف طور پر کہا: ''تم کبھی کبھی بہت گھبرائے ہوئے ہوتے ہو، کسی معاملہ میں پریشان ہو، میں نہیں چاہتا کہ تم اس صورت میں گاڑی چلاؤ''، ہم نے محسوس کیا کہ مجلس کے بعد اس میں پہلے سے زیادہ فہم اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا۔

☆☆☆

نقد و ادب

اسلوب تحریر جس کے پیرہن سے خوشبو آئے

(مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ کا اسلوب تحریر)

ابوفہد ندوی، دہلی

ہم اس مضمون میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اسلوبِ تحریر کے انشائی پہلو پر گفتگو نہیں کریں گے؛ بلکہ اس کی باطنیت یعنی جوش وجذبے، ذوق وشوق اور اس میں پنہاں وفورِ عشق ومحبت اور وارفتگی کے حوالے سے بات کریں گے، جو ان کے قلم کو قوت ورعنائی اور آتش وزیبائی بہم پہنچاتی ہیں، اس میں شیرنی گھولتی ہیں اور ان کے قلم کو ہردم جواں اور ہرلحظہ رواں رکھتی ہیں۔ اور قاری دوران قراءت ایسا کچھ محسوس کرتا ہے جیسے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے جسم وجان اور قلب وروح کے تمام تار وپود کو بیک وقت معطر کر رہے ہیں۔ جیسے بھیگی بھیگی سی کوئی شام ہے اور قاری اس میں مزید بھیگ جانا چاہتا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ وہ بعض دفعہ خود اپنے اوپر لکھی گئی تنقید پڑھ رہا ہوتا ہے اور تب بھی اس کی یہی خواہش ہوسکتی ہے کہ وہ مزید بھیگتا رہے۔ شاید اس کے شوق کو یہ احساس مہمیز کرتا ہے کہ یہ تحریر براہ راست اسی سے مخاطب ہے اور خاص کر اسی کے لیے ہمدردی وخیرخواہی کا بے پناہ جذبہ اپنے ظاہر وباطن میں سموئے ہوئے ہے۔

مولانا مرحوم کی تنقیدات کی اسی خصوصیت کے تعلق سے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے: ''ان کی تحریر وتقریر میں جو اخلاص، دردمندی اور دل سوزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ ان کی سخت سے سخت بات کو مخاطب کے لیے قابل قبول بنا دیتی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عربوں پر کھری کھری تنقید کے باوجود عرب ممالک میں ان کی مقبولیت کسی بھی غیرعرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔'' [مفتی مولانا محمد تقی عثمانی، مضمون: ''توصیف کیا بیاں کریں ان کے کمال'' مطبوعہ: فکر انقلاب، فروری 2019، نئی دہلی]

اسی حوالے سے ایک اور شہادت دیکھیں:

''حضرت مولانا علی میاںؒ کی تمام تنقیدیں تعمیری اور مثبت ہیں، طنز وتعریض سے پاک ہیں، ان کی تنقیدی تحریریں داعیانہ سوز وگداز اور ناصحانہ شفقت ومحبت سے معمور ہیں، ان کی تنقیدوں کو وہ افراد بھی بخوشی پڑھ سکتے ہیں جن کے خلاف وہ تحریریں لکھی گئیں، ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی رکاکت، سفلگی اور سوقیانہ پن کا دور دور تک گزر نہیں ہوا۔ مولانا نے اپنی تنقیدی تحریروں سے تنقید کا بڑا اعلی شائستہ اور شریفانہ معیار قائم کیا ہے جو اردو زبان کا عظیم سرمایہ ہے۔ اختلاف وتنقید میں اگر حضرت مولانا علی میاںؒ کے طرز و اسلوب کو اختیار کیا جائے تو امت کی شیرازہ بندی میں اس کے خوشگوار نتائج سامنے آسکتے ہیں۔'' [مولانا عتیق احمد قاسمی، مضمون: ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تنقیدی

اسلوب''، مطبوعہ: فکر انقلاب، فروری 2019، نئی دہلی]

اگر تحریر کے انشائی پہلو پر نظر رہے تو بہت سے ایسے قلم کار ہیں، کل بھی تھے اور آج بھی ہیں کہ ان کا اسلوب بہت توانا، زندہ اور پرعزم و جواں ہے، مگر یہ بات بجائے خود درست ہے کہ بہت سے ایسے قلم کاروں کے یہاں عشق و محبت کی اتنی فراوانی نہیں جتنی کہ ایک زندہ تحریر کے لیے درکار ہوتی ہے اور ناقدانہ نظر رکھنے والے؛ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر باغیانہ تیور رکھنے والے قاری کو متاثر کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ بے شک ان کے یہاں اعلیٰ تحقیق ہے، نئی معلومات ہیں، بہترین تجزیہ ہے اور معتدل اور قابل عمل رائے ہے اور سب سے بڑھ کر زبان و بیان کی سطح پر ایسی انشا پردازی ہے کہ ان کی تحریریں 'دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است' کا درست مصداق نظر آتی ہیں، مگر ایک وہی بات کہ ان کے باطن میں جذبۂ عشق و محبت اور خلوص و خیر خواہی کی فراوانی نہیں ہے۔ اور یہ تو وہ لوگ ہیں جو نہایت سلجھے ہوئے دماغ اور اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ہیں اور ایسے لوگ بھی کم ہی ہیں، جب کہ زیادہ تعداد تو انھی کی ہے جو بے سرے ہیں، بے درد ہیں اور مرغ بے ہنگام ہیں اور پھر مصیبت یہ بھی ہے کہ رہنما بھی بنے ہوئے ہیں۔

مولانا مرحوم تنہا ایسے قلم کار ہیں کہ جن کا قلم تاعمر کبھی بھی ردعمل کی نفسیات کا شکار نہیں ہوا۔ اعتدال پسندی اور خلوص دل کی ایسی روایت اور بنیاد آپ کو دور دور تک نہیں ملے گی۔ وہ خود فرماتے تھے کہ یہ زمانہ بڑا ہی قحط الرجال کا زمانہ ہے۔ قحط الرجال سے ان کی مراد یہ تھی کہ اب صاحب دل لوگ نہیں رہے: ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے'' یہ مصرع اکثر و بیشتر ان کی زبان پر رہتا تھا۔

اگر آپ طالب علم ہیں 'تو پاجا سراغ زندگی' کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ اس کتاب میں طلبہ کے لیے وہی حمیت، وہی درد، وہی محبت اور وہی جوش ملی اور طوفان عشق و مستی ہے، جو علامہؒ کے اس شعر میں ہے، جس کا ایک مصرع کتاب کے سرنامے پر درج ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

دوسرے مصرعے میں دیکھیں کیا یہ وہی درد اور وہی محبت نہیں ہے جو ایک ماں، ایک استاد اور ایک باپ اپنے ایسے شاگرد اور بیٹے کے سامنے رکھتا ہے جس کی روش بہکی بہکی سی ہے اور جو اپنے مستقبل سے آگاہ نہیں ہے اور اسے فکر بھی نہیں ہے۔ جسے دنیا نے 'آج' میں جینا سکھایا ہے اور جس نے اسے بتایا ہے کہ موج و مستی ہی زندگی کا حاصل ہے، جس نے موج و مستی کے ساتھ زندگی گزار لی گویا اسی نے اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے جی لیا اور وہی کامران و بامراد رہا۔ دنیا نے تو یہی سکھایا کہ 'بابر بعیش کوش، عالم دوبارہ نیست' اور یہ کہ اگر کل مرنا بھی ہے تو اس کل کے بارے میں سوچ سوچ کر آج ہی کیوں مریں اور اس 'آج' کو بھی مر مر کر کیوں جئیں۔ جس بیٹے کی اور جس شاگرد کی ذہنیت اور مزاج یہ بن چکا ہو، اس کے لیے اقبال بے چین اور مضطرب ہو اٹھے ہیں۔ اور یہی تڑپ اور جذبہ آپ کو 'پا جا سراغ زندگی' میں ملے گا۔ یہ جذبہ خیر خواہی اس قدر شدید ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو بحیثیت قاری یہ احساس ہو کہ آخر اس شخص کو میرے بننے سے کیا مل جائے گا اور میرے بگڑ جانے سے اس کا کیا نقصان ہو جائے گا۔

میں اپنے بے تکلف دوستوں اور اہل تعلق سے بارہا کہتا ہوں کہ وہ ردو قدح اور الزامی و جوابی بیانئے کو ترک کر کے ایسے ہی ہمدردانہ، محبت آمیز اور ایسے ہی پرخلوص اور درد و سوز میں ڈوبے ہوئے اسلوب کی طرف آجائیں۔ ایسے اسلوب تحریر؛ بلکہ اسلوب زندگی کی طرف آجائیں جو اقبال کی زبان میں رومی کے سوز و ساز اور رازی کے پیچ و تاب کا آئینہ دار ہو، تاکہ ہماری تحریریں قاری کے لیے شفاف جھیل کے پانی

کی طرح بن جائیں کہ وہ اس میں اپنا سراپا دیکھ سکیں اور خود کو نک سک سے درست کر سکیں۔

اگر کوئی ایسا کر سکا تو نہ صرف یہ ہوگا کہ اس کی تحریر میں چاشنیاں بھر جائیں گی؛ بلکہ اس کی شخصیت ہی ایسے سانچے میں ڈھل جائے گی کہ پھر کوئی اس سے محبت کیے بنا نہیں رہ پائے گا۔ اور اسی سے وہ مسئلے بھی حل ہو پائیں گے جو ہم الزامی اور جوابی بیانیوں (اگر ہم مخلص ہیں) سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے الزامی اور جوابی بیانیوں سے اسی کوشش میں تو لگے ہوئے ہیں کہ ہم جس سے مخاطب ہیں وہ کچھ چیزوں کو، عادات کو، رسم و رواج کو اور ان افکار و خیالات کو، جنھیں ہم مناسب نہیں سمجھتے، چھوڑ دے اور ان عادات، رسم و رواج اور افکار و خیالات کو اپنا لے جو ہمارے ہیں اور جنھیں ہم بزعم خویش حق سمجھتے ہیں۔ مگر اس الزامی اور جوابی بیانیے سے ہو کیا رہا ہے؟ عملاً ہو یہ رہا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کا ماحول پنپ رہا ہے۔ اس ضد کا اگر کچھ تریاق ہے تو یہی محبت، خیر خواہی اور قربانی و جانثاری کا جذبہ اور درد و محبت میں ڈوبی ہوئی زبان اور اسلوب ہے۔

مولانا مرحوم کی تحریروں میں سلاست و روانی اور عشق و محبت کی فراوانی کے علاوہ حالات کا درست تجزیہ، شخصیات اور ان کی علمی و عملی کاوشوں کا منصفانہ محاکمہ، بے لاگ تبصرہ، غیر جانبدارانہ تنقید اور بے جا عقیدت مندی سے اجتناب بھی ہے جب کہ حسن تحقیق اور حسن ترتیب اس پر مستزاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی مولانا کو پڑھتا ہے وہ نہ صرف پڑھتا چلا جاتا ہے بلکہ وہ ان کے ساتھ گویا بندھ سا جاتا ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت کی یہی سحر کاری تھی کہ انہوں نے کسی بھی قابل تعریف شخص کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا اور کسی کی بے جا تعریف و توصیف نہیں کی، غیر ضروری فتوی بازی سے آخری حد تک اجتناب برتا اور تنازعات میں گھرنے سے خود کو بچائے رکھا۔

اگر آپ زبان و ادب کے گرویدہ ہیں اور ادبی شہ پاروں اور تنقیدات کے مطالعے کے شیدائی ہیں تو ''نقوش اقبال'' لے کر بیٹھ جائیں، آپ کا دل بیٹھ بیٹھ نہ جائے تو کہنا۔ بے شک یہ اقبالؒ کے خیالات کی ترجمانی ہے، مگر یہ ترجمانی کچھ ایسی ہے کہ اس میں مؤلف کا اپنا سوز و گداز اور شوق و محبت بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس کے سرنامے پر بھی علامہؒ کا ایک شعر درج ہے اور وہ بھی ایک دردمند دل کی ترجمانی کر رہا ہے:

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

یعنی محبت و دردمندی اور خلوص نیت کے بغیر یہ دنیا اور دنیا کی ہر شے بے قیمت ہے، وہ خام میٹریل کی طرح ہے اور بے روح بدن کی طرح اور بے خوشبو کے پھول کے مانند ہے۔ اگر کسی انسان کی چھوٹی بڑی کسی بھی طرح کی کاوش میں ''خون جگر'' یعنی عرفان و محبت کی آمیزش نہیں ہے تو وہ کاوش بے سود اور بے نتیجہ ہے، وہ ایسے درخت کی طرح ہے جو پھل نہیں دیتا۔ اگر کسی نے مولانا کو پڑھا ہے تو اس کو ضرور اس احساس نے اپنی گرفت میں لیا ہوگا کہ اس کائنات کا سب سے بڑا عنصر محبت اور عرفان ذات حق ہے، اس کے بغیر کسی بھی مال کی، شے کی اور عمل کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جناب ماہر القادری نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس تصنیف میں کارفرما ہے۔'' اگر مولانا مرحوم کی شخصیت کی بات کریں تو ماہر القادری کے الفاظ میں وہ اقبال کے ''مرد مومن'' کے حقیقی مصداق تھے۔

اقبال کے فن کے جن عناصر ترکیبی نے مولانا کو ان کی طرف مائل کیا ان میں سے ایک عنصر جو اقبال کے یہاں افراط کے ساتھ موجود ہے، وہ یہی ''محبت'' ہے۔ اقبال نے محبت کو 'فاتح عالم' کی صفت کے ساتھ مربوط کیا

ہے۔ ع: ''یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم'' اور ایک جگہ مؤمن کے قلب میں موجود اس صفت محبت کو اور خود انھی کے لفظوں میں جذب و مستی کو فرشتوں کی دیگر صفات کے مقابلے میں افضلیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

مولانا مرحوم خود ہی مانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ تحقیق وتصنیف، وعظ وارشاد اور نکتہ رسی سے بڑھ کر انسان کے درد وسوز، محبت و دردمندی اور اخلاص وللہیت کی اہمیت ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''محض خطبات سے، دو چار اچھی تصنیفات سے، قلم کی روانی سے، خیالات کے سلجھاؤ سے، کسی نادر علمی تحقیق سے، محض کسی نئے طرز میں کسی پرانے خیال کو یا نئے جام میں کسی شراب کہن کو پیش کرنے سے زمانے میں کوئی نیا انقلاب اور انقلاب تو بڑی چیز ہے کوئی معمولی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس زمانے میں ضرورت ہے کردار کی، قلب کی درد مندی اور اندرونی سوز کی، ایک ایسی حرارت کی جو اندر ہی اندر جلا رہی ہو، اعصاب کو پگھلا رہی ہو، اور پھر یہ لاوا پھوٹ کر کسی آتش فشاں کی طرح بڑھ رہا ہو اور اس کی تپش اور سوزش سینکڑوں اور ہزاروں دلوں کو گرما رہی ہو۔'' (پاجا سراغ زندگی، صفحہ نمبر: 82، مطبوعہ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام)

مولانا کے یہاں لفظیات کی جو زرخیزی اور بہتات ہے، وہ یقینی طور پر ادب کے مطالعے سے آئی ہے اور اس زرخیزی میں کلام اقبال کے مطالعے کے تئیں ان کے ذوق وشوق اور گرویدگی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ان کے یہاں لفظیات کی کثرت ان کے وفور شوق، شارپ اور وسیع ذہنیت کی غماز ہے اور یہ مضمون اور فکر کے تمام ابعاد تک پہنچے کے لیے ہے۔ اسی لیے وہ ایک ہی معنیٰ کے لیے کئی کئی لفظ لاتے ہیں اور کئی کئی جملے یکے بعد دیگرے لکھتے چلے جاتے ہیں۔

ایسا کر کے وہ یقینی طور پر مضمون کے تمام پہلوؤں، تہہ داریوں اور اس کے تمام اسرار تک پہنچنا چاہتے ہیں اور لفظیات کا ایسا استعمال انھیں ان تمام دوسرے قلم کاروں سے ممتاز اور مختلف بناتا ہے جن کے یہاں لفاظی محض ہے، یا پھر وہ شوخیانہ پہلوؤں کی حامل ہے یا پھر یہ بات ہے کہ وہ قاری پر اپنی انشا پردازی اور لفظیات کے ذخیرے کا رعب جمانا چاہتے ہیں اور مضمون کی روح اور اس کے حقیقی پیغام سے زیادہ محض زور بیان اور لفظی جمع خرچ کے ذریعے ہی داد وصول کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔ مگر مولانا کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا، یہاں تک کہ وہ بھی انھیں یہ الزام نہیں دے سکتے جو ان کے بہی خواہ نہیں ہیں اور ان سے کسی طرح کا بغض رکھتے ہیں، مسلکی وگروہی بغض، یا فکر ونظر کے اختلاف پر مبنی بغض۔

پروفیسر وصی احمد صدیقی نے مولانا مرحوم کی تحریر کی خصوصیات کا کئی جہتوں سے جائزہ لیا ہے۔ ان میں سے ایک جہت مولانا کے اسلوب تحریر کی دلکشی ورعنائی بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا کی تحریر اتنی دلکش کیوں ہوتی ہے اور کیوں لوگوں کے احساسات کو چھوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی تحریر میں مجرد افکار ہوں یا خالص حقیقتوں کا بیان ہو تو گو وہ ایک علمی تحریر ہوگی مگر اثر ڈالنے والی نہ ہوگی۔ مولانا کا بیانِ حقیقت جذبات کی شکل میں دل میں ورود کرتا ہے، ان جذبات کا بیان حقیقی اور فکری زبان میں ہوتا ہے اور شاعرانہ زبان کے ملمع سے بالکل محفوظ۔ یقیناً مناسب موقع پر حضرت مولانا پرجوش اور استعارہ آمیز تحریر لکھ جاتے ہیں، عبارت آرایانہ تکلف سے بالکل دور۔

مولانا کی زبان سالم اور مکمل افکار کی تصویر ہوتی ہے۔ حقیقت اور جمال ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ میرا مطلب

ہے کہ فکر اور ادراک اور اظہار الگ ہونے کے باوجود ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ علم لغت کی لفظی کثرت اور مترادفات کا زیادہ استعمال مولانا کی تصانیف میں کہیں کہیں مل جاتا ہے، مگر وہ متن پر حاشیوں سے زائد نہیں۔ مولانا کی زبان کی ہم آہنگی اس درجے کی ہے کہ اس سے اونچا درجہ تخیل میں نہیں آتا۔

حضرت مولانا حرف و معنیٰ کے اندرونی رشتے سے بخوبی واقف ہیں۔ فکر کی گہرائی اور تخیل کی رعنائی ان الفاظ سے ہم آہنگ ہوگی جو مولانا استعمال کرتے ہیں۔ اضطراب اور خلش کا بیان، مردان کار کے کارناموں کا ذکر، اقدار حیات کا تعین، سب کے لیے الفاظ سے بنی ہوئی فضا الگ ہو جاتی ہے؛ لیکن آفاقیت اور ہمہ گیری سے کوئی بیان خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ کمال بھی کہ چشم زدن میں اشیا کے باطن کو سامنے کر دیا۔ اس شوق، عشق، تپش اور جذبے کے ساتھ جو ان کے بیان کا خاصہ ہے۔ روانی اور بے ساختگی میں کہیں فرق نہیں آتا۔'' [پروفیسر وصی احمد صدیقی، مضمون:'' مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بحیثیت ایک اردو ادیب'' مطبوعہ: فکر انقلاب، فروری 2019، نئی دہلی]

ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مولانا کا اسلوب تحریر عربی اور اردو، دونوں زبانوں میں بڑی یکسانیت رکھتا ہے، اپنی باطنیت کے حوالے سے بھی اور انشاء پردازی کی سطح پر بھی۔ ظاہر ہے کہ دل کا جو درد ہے وہ تو ایک ہی ہے، اب چاہے وہ کسی بھی زبان میں اظہار کا جامہ زیب تن کرے، اندرون ذات کا جو اضطراب ہے، محض زبان کا اختلاف اس کی کیفیت اور شدت کو تو نہیں بدل سکتا، بطور خاص اس وقت جب قلم کار کو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت اور مکمل عبور حاصل ہو۔

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ انشاء پردازی اور جملوں کی ساخت پرداخت کی سطح پر بھی مولانا کی دونوں زبانوں کی تحریریں بڑی مماثلت رکھتی ہیں، وہی لمبے لمبے جملے، وہی لفظیات اور مترادفات کی کثرت، حتی کہ وہی سلاست اور روانی بھی۔ اور وہی ایک عالم دین کی تفنن طبع کے طور پر کہی ہوئی بات کہ مبتدا ایک صفحے پر تو خبر دوسرے صفحے پر۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا اکثر و بیشتر فکر اسلامی کا غیر اسلامی افکار سے تقابل کرتے ہوئے چلتے ہیں، مثلاً اگر وہ فکر اسلامی کے کسی اخلاقی یا قانونی اصول کو بیان کرنا شروع کریں گے تو پہلے اس تعلق سے ایک دو آپس میں مربوط جملے لکھیں گے اور پھر دیگر ادیان اور دیگر انسانی معاشروں اور تہذیبوں سے اس کا تقابل کریں گے اور پھر آخر میں فکر اسلامی کی اخلاقیات کی برتری ثابت کرتے ہوئے بات مکمل کریں گے۔ اگر آپ غور کریں گے تو پائیں گے کہ مولانا کی دونوں زبانوں کی تحریروں میں کئی سطح پر یکسانیت در آئی ہے۔ شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ ان کی دلنواز شخصیت ہے جو ان کی عربی و اردو ہر دو زبانوں کی تحریروں میں رچ بس گئی ہے۔ اور اسلوب تحریر قلم کار کی شخصیت کا ہی تو پرتو ہوتا ہے۔

مولانا کی شخصیت، اسلوب زندگی اور اسلوب تحریر کی درج بالا خوبیوں اور اعلیٰ صفات کی ہر اس شخص نے پذیرائی کی ہے جس نے مولانا کو تعصّبات کی عینک اتار کر پڑھا ہے۔ اس کی شہادت کے طور پر چند خوش نویسوں کے چھوٹے چھوٹے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

شیخ محمد المجذوب ملک شام کے جلیل القدر عالم دین، مبلغ، مصنف اور ادیب تھے، وہ شام میں 1907 میں پیدا ہوئے اور 1999 میں وفات پائی، مدینہ منورہ ہجرت کی اور مدینے میں الجامعۃ الاسلامیۃ میں استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، شیخ محمد المجذوب چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ اپنی کتاب ''علماء و مفکرون عرفتہم'' میں مولانا مرحوم کی عربی تحریروں کی سحر انگیزی اور جادو بیانی کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

''شیخ ندوی کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ ان کی ادبی تحریر میں ایک ایسا جادو ہے جو عموماً دوسرے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتا۔'' (بحوالہ: شاہد ندوی بارہ بنکوی، مضمون: ''علی میاں ندویؒ عرب علماء ودانشوروں کی نظر میں''، مطبوعہ: فکر انقلاب، فروری 2019، نئی دہلی)

انھی کی مزید ایک شہادت:

''علامہ ندوی (سید ابوالحسن علی) کی تحریر پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ ان کی عبارت میں غیر معمولی اثر ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، ان کی تحریروں کو پڑھنے والا مسحور سا ہوجاتا ہے، وہ ان خاص اہل دل افراد میں سر فہرست ہیں جو اپنے جذبات کی شدت ووفور اور جولانی وروانی کو قرطاس تک منتقل کردیتے ہیں، یہ وہ جوہر ہے جو خاص روحانی ذوق رکھنے والے ادباء کے یہاں ملتا ہے۔'' (فکر اسلامی نمبر، جامعہ اسلامیہ، بستی)

مولانا نور عالم خلیل امینی؛ مدیر ''الداعی'' دیوبند، رقم طراز ہیں:

''میں نے صرف اردو میں نہیں عربی میں بھی تحریروں کے بادشاہوں کو پڑھا ہے، تقریر کے جادوگروں کو سنا ہے، الفاظ کے شہنشاہوں کو برتا ہے، فصاحت اور بلاغت کا دریا بہانے والوں کا تجربہ کیا ہے، مطالعہ اور معلومات کی گمنام اور تاریک سرنگوں میں بے خطر بہت دور تک جانے والے بہت سے لوگوں کا علم ہے؛ لیکن خدا اور رسول کو گواہ بنا کر کہنے دیجیے کہ تحریر وتقریر کے لفظ لفظ نہیں، حرف حرف پر اور ہر زیر وبم پر خلوص کا جو حسن، ایمان ویقین کی جو مہرتابی، درد دل کی جو لذت، انسانوں سے محبت کا جو جمال، کلمۃ اللہ کا جو جلال، صدائے حق کی جو دل نوازی اور سوز دروں کی جو تمازت اور فقر غیور اور زہد پرنور کی جو جاذبیت اور حرارت میں نے'' مولانا علی میاں ندوی'' کے یہاں محسوس کی وہ میرے محدود علم ومطالعہ میں کسی کے یہاں نہیں ملی۔'' (بحوالہ: پس مرگ زندہ)

حقانی القاسمی صاحب جو ایک معروف قلمکار اور ادبی، سیاسی اور سماجی تجزیہ نگار ہیں، اپنے مضمون ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نثری بیانیہ'' میں لکھتے ہیں: ''علی میاں، عربی زبان وادب کے صاحب طرز ادیب تھے اور ان کی عظمت کا نقش عرب کے بڑے بڑے فصحا وبلغا کے ذہنوں پر قائم ہے۔ مولانا علی میاں اردو کے بھی ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ وہ کون سی صنف ہے جس میں مولانا ابوالحسن ندوی نے اشہب قلم نہ دوڑائے۔ کون سا ایسا موضوع ہے جسے ان کا قلم چھو کر نہ گزرا۔ انھوں نے سفرنامے لکھے تو ایسے کہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کی یاد تازہ ہوجائے اور خاکے لکھے تو ایسے کہ کیا کوئی اردو کا سقراط اور بقراط لکھے گا اور خودنوشت لکھی تو ایسی کہ پڑھنے والے کے دل میں ویسی ہی زندگی جینے کی تمنا جاگ اٹھے۔ وہ ہمیشہ سچے شبد لکھتے رہے اور بولتے رہے۔ ان کی کسی بھی تحریر یا تقریر میں مداہنت کا کوئی شائبہ تک نہیں۔''

مولانا زاہد الراشدی کی شہادت بھی پڑھیں:

''اردو تو مولانا ندویؒ کی گھر کی زبان تھی مگر عربی کو بھی ان سے کبھی اجنبیت کی شکایت نہ ہوئی۔ وہ عربی ایسی قدرت اور روانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے کہ خود عربوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے بعض عرب دانشوروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا خطاب اس لیے سنا کرتے تھے کہ ان کی زبان کی چاشنی اور سلاست وفصاحت کا حظ اٹھا سکیں۔''

(روزنامہ اوصاف ۱۴ جنوری ۲۰۰۰ء)

مولانا علاء الدین ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''مولانا کا علم وفن شعوری اور گہری فکر کا نتیجہ ہے، مستعار نہیں ہے۔ گہری اور شعوری فکر ونظر کے نتیجے میں ظاہر ہونے والا علم ہی سرچشمۂ حکمت ومعرفت ہوتا ہے جب کہ مستعار علم صرف معلوماتی ہوتا ہے۔ مولانا کے ادب میں ایک رواں دواں اور پیہم جواں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی زندگی

ادب وفن میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں خون جگر کی آمیزش کے ساتھ عشق وعمل کی روح پھونک دی گئی ہو۔'' [مولانا محمد علاء الدین ندوی، مضمون: ''علی میاں تعمیری ادب کا اعلیٰ نمونہ''، مطبوعہ: فکر انقلاب، فروری 2019، نئی دہلی]

اقبال کی شخصیت، فن اور فکر تینوں چیزوں نے مولانا کو بہت متاثر کیا ہے اور اس کی خوب ترشہادت اقبال پر ان کی کتاب 'نقوش اقبال' ہے۔ مولانا اپنی تحریروں اور تقریروں میں جابجا کلام اقبال کو کبھی زور بیان کے لیے استعمال کرتے ہیں تو کبھی استشہاد کے طور پر، یہاں تک کہ اپنی کئی کتابوں کے نام اور عناوین بھی اقبال کے کلام سے اخذ کیے ہیں۔ اقبال کے ساتھ مولانا کی ذہنی وفکری ہم آہنگی جذباتی اور وقتی نہیں تھی، یہ علی وجہ البصیرہ استوار ہوئی تھی اور پھر تمام عمر استوار رہی۔

اقبال جس دور میں پیدا ہوئے تھے وہ مسلم دنیا کی غلامی کا دور تھا۔ وہ اجڑے گلستاں میں بلبل نالاں کی مانند تھے، ان کی زندگی کی تمامتر سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو تھی، ان کی شخصیت کا خمیر رومی کے سوز وساز اور رازی کے پیچ وتاب سے اٹھا تھا۔ انہیں بڑا قلق اور اضطراب تھا کہ ان کے خزاں رسیدہ چمن میں کوئی رومی نہیں اٹھا۔ رومی کو زندگی بھر قلق رہا کہ وہ سنائی وعطار کے غیاب کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ ع: ''ما از پئے سنائی وعطار آمدیم'' اور اقبال کو اس بات کا قلق رہا کہ وہ رومی کے بھی بہت بعد وجود کے لباس میں جلوہ گر ہو سکے۔ ع: ''نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے'' غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ جب سنائی وعطار کے لیے رومی کی حسرتوں اور پھر خود رومی کے لیے اقبال کی حسرتوں کا عالم یہ ہے تو پھر رسول اور اصحاب رسول ﷺ کے لیے ان کی حسرتیں کس قدر قیامت خیز رہی ہوں گی۔ ان حسرتوں نے انہیں کیا کیا نہ مضطرب اور بے چین کیا ہوگا۔

اقبال مشرق ومغرب کے مے خانوں میں، بہار نو کے گہواروں میں اور خزاں رسیدہ چمنستانوں میں، ہر جگہ گھوم پھر آئے مگر ان کے دل کا قرار نہ یہاں تھا اور نہ وہاں، انہیں یہ بھی آدھا ادھورا سا لگا اور وہ بھی ناقص وناکمل۔ تاہم انہوں نے اپنی دوربیں نظر اور حاضر وموجود سے پرے دیکھنے والی نگاہ کے ذریعہ جان لیا تھا کہ ادھر کیا نقص ہے اور ادھر کیا کمی ہے۔ اور وہ پکار اٹھے، ع: ''یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا''۔ باوجود اس کے کہ اقبال کی ساری زندگی کھوئے ہوؤں کی سرگزشت ہے تاہم وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو جانے والے نہ تھے اور نہ ہی 'آج' کی سرمستیوں سے بدمست ہو جانے والے تھے بلکہ ان کی دوربیں نگاہیں آئندہ کل پر رہتی تھیں۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں

کم وبیش یہی حال مولانا علی میاں مرحوم کا بھی تھا، وہ بھی ایک اجڑے گلستاں کے بلبل نالاں تھے، مگر اقبال ہی کی طرح وہ بھی یہ یقین رکھتے تھے کہ اس گلستاں میں ایک بار پھر بہار آئے گی، پھول کھلیں گے اور قمریاں نغمہ زن ہوں گی۔ گلستاں کی ویرانیوں نے انہیں ناامیدی اور مایوسی کی اندھیری غار میں نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کے بصیرت افروز تجزیے سے ان کے اندر بیدار رہنے اور قوم وکارواں کو بیدار کرنے کی امید کی شمع روشن ہوئی۔

انہوں نے بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو کی اور ''تاریخ دعوت وعزیمت'' جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی۔ ان کی راتیں بھی اسی کشمکش میں گزرتی تھیں کہ کبھی رومی کا سوز و ساز ان کا لہو گرماتا تھا اور کبھی رازی کا پیچ وتاب انہیں مضطرب رکھتا تھا۔ انہیں بھی بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس تھا کہ عجم

کے لالہ زاروں سے پھر کوئی رومی نہیں اٹھا۔ اور وہ بندے جن کا فقر قیصر و کسریٰ کے لیے موت کا سبب تھا اب ایران سے تو ران تک کہیں موجود نہیں ہیں۔ اور اس کا خسارہ نہ صرف مسلمان بلکہ ساری دنیا اور کل انسانیت بھگت رہی ہے، اسی احساس نے ان سے ''ماذا خسر العالم۔'' لکھوائی۔

اقبال نے مغربی تہذیب کو خبردار کیا اور کہا، ع:

''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی''

مولانا نے بھی مغربی تہذیب پر عالمانہ تنقید کی اور صاف صاف کہا کہ جو تہذیب اپنا رشتہ خدا سے استوار رکھنے کے بجائے مادیت کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے گی وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتی اور اگر رہے گی بھی تو تباہی و بربادی لائے گی۔ انہوں نے جگہ جگہ اور جا بجا اہل مغرب سے خطاب کیے اور ان پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان کی تہذیب کس طرح خودکشی کی راہ پر چل پڑی ہے۔ اور پھر وقت کے سات ہی ساتھ ان کی اکثر کتابیں مغرب پر تنقید سے بھر گئیں۔ جبکہ ''ماذا خسر العالم۔'' ''مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں'' اور ''مغرب اور اسلام'' تو مغرب کی تنقید پر مستقل کتابیں ہیں۔

مولانا نے بھی مشرق و مغرب کے مے خانے دیکھے تھے اور علم و بصیرت کی روشنی میں ان کی تہذیب و تمدن کا جائزہ لیا تھا اور انہیں بھی بجا طور پر احساس تھا کہ مشرق و مغرب دونوں جہانوں میں ایک خلا ہے، دونوں طرف کسی نہ کسی چیز کی اور نقص ہے، خاص کر وہی جس کی طرف اقبال نے اشارہ دیا تھا کہ یہاں مشرق میں ساقی نہیں یعنی صاحب قرآنی شخصیت کے حامل قائد نہیں اور اعلیٰ قدروں پر استوار قیادت نہیں۔ دوسری طرف مغرب میں ساقی بھی ہے اور صہبا بھی، مگر ساقی اعلیٰ اخلاقیات کا حامل نہیں اور صہبا میں وہ نشہ نہیں جو پینے والے کو دیوانہ بنادے۔

مغرب کی تہذیب، سیاسی اخلاقیات، اور مذہبی تعلیمات و روایات ہی کم مایہ و فروتر ہیں، اب انہیں سونے کے گلاس میں پیش کیا جائے یا شیشے کے صراحی میں اور خواہ ساقی خود کتنا بھی ہنرمند اور سلیقہ شعار ہو، کسی چیز کا کچھ حاصل نہیں جبکہ اس میں وہ نشہ ہی نہ ہو جو طبیعت کو دوآتشہ بنا سکے، جو معرفت الٰہی کا درس دے سکے اور خالق و مخلوق کے درمیان رشتے کو مستحکم کر سکے۔

مولانا کو بھی مشرقی دینی تعلیم و تربیت پر، دل درد مند کے ذوق و شوق پر، اہل اللہ کے خلوص و للّٰہیت پر اور ان کی ایمانداری و جانثاری پر ایسا ہی اعتماد اور ایسا ہی بھروسا تھا کہ وہ اس بھروسے اور اعتماد کو دنیا و آخرت کی متاع بیش بہا تصور کرتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ ان کے اپنے کارواں میں انہیں سب چیزوں کی فراوانی و ارزانی ہو۔ وہ اقبال کی طرح بہت دل سے یہ چاہتے تھے کہ اپنے قلب و نظر اور فکر و عمل کی ساری خوبیاں، ساری آرزوئیں اور ساری نیازمندیاں یک لخت جمع کریں اور اپنے قافلے پر اس طرح لٹا دیں جس طرح نوشے میاں پر پھول اور پیسے لٹائے جاتے ہیں۔

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری
امیدیں مری، جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہ حیات
گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے!

یہی وہ شوق و محبت ہے اور یہی وہ بے چینی و اضطراب ہے جس نے مولانا کی تحریروں میں ریشم جیسی ملائمیت، شبنم جیسی ٹھنڈک اور شہد جیسی شیرینی بھر دی ہے۔ غالب نے کہا ہے:

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

دل گداختہ کے بغیر کسی بھی قسم کے سخن، کلام میں اور کسی بھی قسم کی تحریر میں حسن و زیبائی پیدا نہیں ہو سکتی اور شیرینیاں نہیں گھولی جا سکتیں۔ اور توفیق ایزدی سے مولانا مرحوم کو یہ صفت وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی، تبھی یہ ممکن ہو سکا کہ ان کی تحریروں میں محبتیں اور لطافتیں، عشق اور سرمستیاں اس طرح بھر گئی ہیں کہ: ''شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم''

رومی نے شمس تبریز کے لیے کہا کہ رومی ان سے ملاقات سے پہلے محض ایک خاک کا ذرہ تھا:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور اقبال نے رومی کے لیے کہا کہ رومی نے خاک اقبال کو اکسیر کر بنا دیا:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

اور ہم نے بارہا مولانا کی زبانی سنا، وہ طلبہ و اساتذہ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ کسی نہ کسی کو اپنا روحانی سرپرست اور پیشوا مان کر چلو۔ اگر زندوں میں کوئی زندہ دل دستیاب نہ ہو سکے تو فوت شدگان میں سے کسی کو اپنا روحانی اور اعتقادی و علمی رہنما تسلیم کر لو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عشق و محبت کے عناصر دلوں سے دلوں کی طرف منتقل ہوتے ہیں، مجرد علم اور معریٰ کتابیں یہ عناصر پیدا نہیں کر سکتیں۔ پاجا سراغ زندگی سے یہ اقتباس دیکھیں:

''۔آپ اپنی زندگی کے لیے ایک شخصیت کا انتخاب کر لیں، یہ حقیقت ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی مخلص بندہ آپ کو کہیں مل جائے تو اس کو آپ اپنا رہنما مان کر اپنی زندگی کی نئی تعمیر شروع کریں، اس میں آپ کو پورا پورا اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اور جہاں چاہیں ایشیا یا ایشیا کے باہر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں آپ اس کو دریافت کر لیں، بلکہ میں آگے بڑھ کر یہاں تک کہتا ہوں کہ زندوں میں آپ کو کوئی ایسا نظر نہ آئے تو ماضی کی شخصیتوں میں اس کو تلاش کیجئے اور جہاں کہیں یہ بندۂ خدا آپ کو ملے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیجئے اور کچھ دنوں تک اس کی ہر چیز کو اپنے اندر منتقل کرنے کی کوشش کیجئے، انسان میں یہ صفت بہت نمایاں طور پر ہے کہ وہ جس چیز کو چاہتا ہے، اس کو نقل کر لیتا ہے، آپ اس کی ہر چیز کی نقل اتاریے اس کے بعد آپ بڑے ہو سکتے ہیں، آپ اس سے آگے بھی نکل سکتے ہیں، اور ایسی جگہ بھی پہنچ سکتے ہیں جہاں آپ کو اس تعلق کی ضرورت نہ ہوگی، اگر چہ یہ بات بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔'' (پاجا سراغ زندگی، صفحہ نمبر: 35)

اور شیخ سعدی نے تو کہا ہی ہے:

جمال ہمنشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

اگر مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم مولانا مرحوم کی مشہور و معروف کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' کے ساتویں باب سے وہ چند صفحات (397 تا 403) ضرور نقل کرتے جو مولانا نے ''عالم اسلامی کا پیغام'' کے ذیلی عنوان کے تحت تحریر فرمائے ہیں۔ اس میں مولانا کے قلم کی جولانی اور طبیعت کی روانی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو موقع ملے تو ضرور ان صفحات کا مطالعہ کریں۔

☆☆☆

❑ پیام عمل

آسی یہ غنیمت ہیں تیری عمر کے لمحے

عبدالرشید طلحہ نعمانی

کمالِ آدمیت کو داغ دار بنانے اور جوہرِ انسانیت کو بے رنگ ونور کردینے والے اسباب میں ایک جمود وتعطل بھی ہے، جو انسان سے حس وحرکت، جوشِ عمل اور جہدِ مسلسل کو ختم کردیتا ہے۔ جمود صرف یہ نہیں ہے کہ انسان فکرِ معاش سے غافل رہے، کھانے کمانے کے جائز وسائل اختیار نہ کرے اور بے وجہ دوسروں کے لیے بوجھ بنا رہے؛ بل کہ یہ چیز بھی جمود میں داخل ہے کہ آدمی کسب حلال سے فراغت کے بعد کسی دوسری مشغولی سے جی چُرائے، اپنی ذات کو سنوارنے، باطن کو نکھارنے اور علم و عمل میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے لیے کسی طرح کی کوئی جدوجہد نہ کرے۔ یہ تعطل و بے کاری انسانی صلاحیت واستعداد کو ناکارہ کردیتی ہے، قوت فکر وعمل کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے، اور عمر نوح پانے کے باوجود بھی انسان اپنے اندر چھپے انمول جواہر کی قیمت وصول نہیں کر پاتا، اور اللہ تعالی کی دی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے۔

ان دنوں نہ صرف وطن عزیز؛ بل کہ دنیا بھر میں کرونا وائرس کی دوسری لہر نے دہشت مچا رکھی ہے؛ جس کے سبب لاکھوں افراد موت کا لقمۂ تر بن چکے ہیں، کروڑوں انسان اس وبا سے بری طرح متاثر ہیں اور اربوں لوگ ایسے ہیں جو مسلسل خوف و ہراس کے سایے تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس وبائی بیماری کی روک تھام کے لیے بھارت سمیت مختلف ممالک میں کہیں ایک ماہ اور کہیں دو تین ماہ کے لیے لاک ڈاؤن (مکمل بند) کا اعلان ہو چکا ہے، نیز حالات کی سنگینی کے پیش نظر اعلان کردہ مدت میں مزید توسیع کے امکانات بھی ہیں۔

پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے بند کے عمومی ماحول کے باوجود نوجوانوں کی بڑی اکثریت گلیوں میں گھومنے پھرنے، قانون شکنی کے ذریعہ انتظامیہ کو تنگ کرنے اور سوشل میڈیا پر اپنا وقت ضائع کرنے میں مصروف نظر آرہی ہے، حال آں کہ یہ قیمتی وقت پڑھائی لکھائی اور دیگر اہم خدمات (خانگی امور میں گھر والوں کی معاونت، دینی ودنیوی کتابوں کا مطالعہ، فاقہ مستوں، مسکینوں اور محتاجوں کی امداد وغیرہ) کی انجام دہی کے ذریعہ کار آمد بنایا جاسکتا ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے سچ فرمایا، جب آپ سے پوچھنے والوں نے پوچھا کہ ہم پر جو

مختلف نوعیّتوں کی آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں، ہمیں کیسے پتہ چلے کہ یہ اللہ کا عذاب وعتاب ہے یا آزمائش وامتحان؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ نازل شدہ آفات ومصائب کے نتیجہ میں اگر قلب اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے تو وہ آزمائش وامتحان ہے اور اگر جمود وتعطل اسی طرح برقرار رہتا ہے اور قومی واجتماعی مزاج میں کسی طرح کا کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا ہے تو یقین کر لیجیے کہ وہ اللہ کا عذاب و عتاب ہے۔

وقت کی اہمیت اور کتاب وسنت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر مختلف اوقات کی قسم کھائی ہے جس سے وقت کی بے پناہ اہمیت اجاگر ہوتی ہے؛ کیونکہ اللہ عزوجل کبھی بھی کسی کمتر چیز کی قسم نہیں کھاتے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفجر میں 'وقت فجر اور عشرۂ ذوالحجہ' کی قسم کھائی اور ارشاد فرمایا: ''اس صبح کی قسم (جس سے ظلمتِ شب چھٹ گئی) اور دس (مبارک) راتوں کی قسم''۔ (الفجر) ایک اور مقام پر رات اور دن کی قسم کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''رات کی قسم جب وہ چھا جائے (اور ہر چیز کو اپنی تاریکی میں چھپالے) اور دن کی قسم جب وہ چمک اٹھے''۔ (اللیل) اور سورۃ الضحیٰ میں 'چاشت کے وقت اور رات' کی قسم کھاتے ہوئے یوں فرمایا: ''قسم ہے چاشت کے وقت کی (جب آفتاب بلند ہوکر اپنا نور پھیلاتا ہے) اور قسم ہے رات کی جب وہ چھاجائے''۔ (الضحیٰ) پھر سورۃ العصر میں 'زمانہ کی قسم' کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''زمانے کی قسم (جس کی گردش انسانی حالات پر گواہ ہے) بے شک انسان خسارے میں ہے (کہ وہ عمرِ عزیز گنوا رہا ہے)''۔ (العصر) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بزرگوں میں کسی کا قول ہے کہ میں نے سورۂ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آوازیں لگا رہا تھا کہ، رحم کرو اس شخص پر، جس کا سرمایہ گھلا جارہا ہے! رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جارہا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میں نے کہا: یہ ہے: ''إن الانسان لفی خسر'' کا مطلب۔ عمر کی جو مدت انسانوں کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اس کو اگر ضائع کیا جائے یا غلط کاموں میں صرف کردیا جائے تو انسان کا خسارہ ہی خسارہ ہے''۔ (تفسیر کبیر)

مذکورہ تمام آیات مبارکہ میں اللہ رب العزت نے فجر، صبح، چاشت، رات، دن اور زمانہ کی قسم کھا کر وقت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اصول ہے کہ وہ ہمیشہ غیر معمولی چیز کی قسم کھاتا ہے۔ لہٰذا ان آیات میں جو اس نے مختلف اوقات کی قسم کھائی ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے؛ بلکہ اس کے ذریعے درحقیقت ہمیں جھنجھوڑا جارہا ہے کہ اپنی زندگی کے اوقات کو معمولی اور حقیر نہ سمجھو، اس کے ایک ایک لمحے کا تم سے حساب ہونا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں سب سے سستی اور بے قیمت چیز اگر ہے تو وہ نظم و ضبط اور فرصت و فارغ البالی ہے، اس کی قدر و قیمت کا ہمیں قطعاً احساس نہیں؛ یہی وجہ ہے کہ وقت کے لمحات کی قدر نہ کرنے سے منٹوں کا، منٹوں کی قدر نہ کرنے سے گھنٹوں کا، گھنٹوں کی قدر نہ کرنے سے ہفتوں کا، ہفتوں کی قدر نہ کرنے سے مہینوں کا، اور مہینوں کی قدر نہ کرنے سے سالوں اور عمروں کا ضائع کرنا ہمارے لیے بہت آسان ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر زندگی میں وقت کی قدر نہ کی جائے اور اسے غفلت، سستی وکاہلی میں گزارتے ہوئے برائی اور شر کی نذر کردیا جائے تو کل

مایوسی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا،سورۃ الفاطر میں ارشاد ربانی ہے، قیامت کے دن بندے سے سوال ہوگا: کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا، وہ سوچ سکتا تھا اور (پھر) تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آچکا تھا، پس اب (عذاب کا) مزا چکھو، سو ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہ ہوگا۔'' دنیا دارالامتحان ہے، یہاں کیے ہوئے ہر عمل کا حساب دینا ہے، یہی وہ بنیادی فلسفہ ہے جس کے باعث اسلام میں نظم وضبط اور وقت کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے نیز اسے ضائع کرنے کے ہر پہلو کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ایک موقع پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:''قیامت کے دن بندہ اس وقت تک (اللہ کی بارگاہ میں) کھڑا رہے گا جب تک کہ اس سے چار چیزوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے:

ا۔اس نے اپنی زندگی کیسے گزاری؟۔۲۔اپنے علم پر کتنا عمل کیا؟۔۳۔مال کہاں سے کمایا اور کیسے خرچ کیا؟۔۴۔اپنا جسم کس کام میں کھپائے رکھا؟۔'' (جامع ترمذی) اس حدیثِ پاک میں ہر صاحبِ ایمان کے لیے یہ تعلیم ہے کہ اس فانی زندگی کے اوقات کو بہت دھیان اور توجہ کے ساتھ گزارے، زندگی کو مرنے سے پہلے غنیمت سمجھے اور اس بات کا استحضار رکھے کہ کل روزِ قیامت اس کی ہر ہر چیز کا حساب ہوگا،اس سے ہر چیز کے بارے میں بازپُرس ہوگی اور اسے اپنے ہر ہر قول وفعل کا جواب دینا ہے اور قیامت کے دن اس کے اعمال نامے کو تمام اوّلین وآخرین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

وقت بڑی قیمتی دولت ہے، اس سے جو فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، وہ کرلیا جائے، آج صحت وتندرستی ہے، کل نہ معلوم کس بیماری کا شکار ہوجائے، آج مال و دولت کی فراوانی ہے کل خدا جانے فقر وتنگ دستی کا منہ دیکھنا پڑ جائے؛ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''اگر قیامت قائم ہوجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کا چھوٹا سا پودا ہو تو اگر وہ اس بات کی استطاعت رکھتا ہو کہ وہ حساب کے لیے کھڑا ہونے سے پہلے اسے لگالے گا تو اسے ضرور لگانا چاہیے۔'' (مسند احمد بن حنبل) یہ آپ ﷺ امت کو کس طرح وقت کی اہمیت اور اعمال صالحہ کا احساس دلا رہے ہیں کہ اگر قیامت قائم ہوجائے اور کوئی اس نفسانفسی کے عالم میں بھی ذرہ بھر نیکی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو تو اس میں بھی غفلت کا مظاہرہ نہ کرے؛ بلکہ فوراً نیکی کرڈالے۔

وقت کے حقیقی قدرداں:

اگر ہم مشاہیر وقت اور علماء امت کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو یہ بات نمایاں ہوکر سامنے آئے گی کہ انہوں نے اپنے وقت کی حقیقی معنی میں قدر کی، تبھی تو صدیاں گزرنے کے باوجود وہ تاریخ کے اوراق میں زندہ وتابندہ ہیں۔ وقت کی اہمیت پر ان عظیم ہستیوں کے چند اقوال و احوال بھی ملاحظہ فرماتے چلیں!

جلیل القدر صحابی حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: جب صبح کرے تو شام کا انتظار نہ کر، جب شام کرے تو صبح کا خیال دل میں مت لا، اور بیماری سے پہلے اپنی صحت میں سے حصہ لے لے، اور موت سے پہلے زندگی سے فائدہ اٹھالے، کیوں کہ اے عبداللہ! تو نہیں جانتا کہ کل تیرا نام کیا ہوگا، مردہ یا زندہ۔عامر بن قیس ایک زاہد تابعی تھے، جب ایک شخص نے ان سے کہا: آؤ! بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں! تو انہوں نے جواب دیا کہ پھر سورج کو بھی ٹھہرالو۔ فتح بن خاقان مشہور عباسی خلیفہ المتوکل کے

وزیر تھے، وہ اپنی آستین میں کوئی نہ کوئی کتاب رکھتے تھے اور جب انہیں سرکاری کاموں سے فرصت ملتی تو آستین سے کتاب نکال کر پڑھنے میں لگ جاتے۔ اسماعیل بن اسحاق القاضی کے گھر جب بھی کوئی جاتا تو انہیں پڑھنے میں مصروف پاتا۔ البیرونی کے شوق علم کا یہ عالم تھا کہ حالت مرض میں مرنے سے چند منٹ پہلے وہ ایک فقیہ سے (جو ان کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا) میراث کا مسئلہ پوچھ رہے تھے۔ علامہ ابن جوزی کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ایک ہزار ہے، وہ اپنی عمر کا کوئی لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے تھے، نیز اپنے قلم کے تراشے سنبھال کر محفوظ رکھتے تھے، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان تراشوں سے گرم کردہ پانی سے انہیں غسل دیا گیا۔ وہ اپنے روزنامچے "الخاطر" میں ان لوگوں پر افسوس کرتے ہیں جو کھیل تماشے میں لگے رہتے ہیں، ادھر ادھر بلا مقصد گھومتے رہتے ہیں، بازاروں میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو گھورتے ہیں اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ پر تبادلۂ خیال کرتے رہتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ایک سو سے کم نہ ہوگی۔ صرف تفسیر کبیر تیس سے زائد جلدوں میں ہے، وہ کہا کرتے تھے کہ کھانے پینے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے میں ہمیشہ اس پر افسوس کرتا رہتا ہوں۔ (ملخص از عملی زندگی:۲۲۲)

دن بھر کا ایک نظام العمل بنائیں!

وقت کی پابندی اور حرکتِ عمل انسان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آج وہی قومیں ترقی کی انتہا پر ہیں جنہوں نے وقت کی قدر کی، وقت کی قدر نہ کرنے والی قومیں ناکام اور نامراد رہتی ہیں۔ جو لوگ وقت کی اہمیت سے واقف ہیں وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے اور آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتے۔ اگر ہم اپنے اِرد گرد ایک نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ ساری کی ساری کائنات پابندئ وقت کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے، دن اور رات کا اپنے وقت پر نمودار ہونا، چاند اور سورج کا اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہونا، موسموں کا تبدیل ہونا اور کھیتوں میں فصل کا پکنا، سب کے مقررہ اوقات کار ہیں۔ فطرت کے ان تمام عناصر میں کبھی کوئی بے قاعدگی نہیں ہوتی۔ یہ سارا نظامِ کائنات ہمیں وقت کی پابندی کا ہی درس دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ لاک ڈاؤن کی موجودہ صورت حال میں ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ ہم اپنا ایک نظام العمل مرتب کریں، صبح اٹھنے سے لے کر رات میں سونے تک ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام طے کریں۔ سارا وقت خواب غفلت میں سوتے رہنے اور سوشل میڈیا وغیرہ پر ضائع کرنے کے بجائے، کتابوں کا مطالعہ، نوافل کی کثرت، تلاوت کلام پاک کا اہتمام، ذکر و اذکار اور توبہ و استغفار کا التزام کریں۔ اس سے ان شاء اللہ حالات بھی درست ہوں گے اور اخروی نجات بھی حاصل ہوگی۔

آسیؔ یہ غنیمت ہیں تری عمر کے لمحے
وہ کام کر اب، تجھ کو جو کرنا ہے یہاں آج

☆☆☆

❑ احتساب

ذمہ داران مدارس ومساجد وجمعیات کے نام

(امانت داری کے حوالے سے ایک دردمندانہ پیغام)

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، استاذ ومفتی جامعہ دارالسلام عمرآباد

ارشاد باری تعالی ہے:فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّه (بقرة .۲۸۳)

ترجمہ: جو امین بنایا گیا ہے اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کرے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے جس کے پاس امانت کا پاس ولحاظ نہ ہو، اور اس کی دینداری کا کوئی بھروسہ نہیں ہے جس کے پاس وعدے کا پاس ولحاظ نہ ہو۔(صحيح ابن حبان ، حديث نمبر ۱۹۴ وقال شعيب الأرنوط .اسناده حسن فی الشواهد)

مذکورہ نصوص میں امانت داری کو تقوی سے جوڑ دیا گیا ہے ،یعنی جس کے دل میں اللہ کی عدالت اور اس کی مضبوط گرفت اور حساب وکتاب پر یقین ہوگا، وہ امانتوں میں خیانت نہیں کرے گا۔خیانت کا عام ہونا بھی قرب قیامت کی علامت ہے۔نبی کریم ﷺ نے ایک بار پیشین گوئی فرمائی کہ زمانہ قیامت جیسے جیسے قریب ہوگا ایمانی قوت کم ہوتی چلی جائے گی،اس کے نتیجہ میں امانت داری بھی اٹھ جائے گی،اور حال یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادی ہوگی مگر امانتدار پوری آبادی میں ایک آدھ بڑی مشکل سے دستیاب ہوگا اور وہ بھی حقیقت میں امین نہ ہوگا۔لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانتدار شخص ہے،آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج ،اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمانداری نہ ہوگی ۔ (صحیح بخاری۔کتاب الفتن ۷۰۸۶)

شریعت اسلامیہ میں امانتداری کی بڑی اہمیت کے باوجود معاشرہ میں اس صفت کی کوئی حیثیت نہیں ہے،جنہیں دنیا ایماندار اور امانتدار تصور کرتی ہے ویسے لوگ ہی بے ایمانی اور خیانت میں نمایاں نظر آتے ہیں، حالانکہ امانت ودیانت شرعاً دینی فریضہ ہے۔امانت کا لوگوں میں محدود تصور ہے،یعنی مالی امانت کو ہی لوگ امانت سمجھتے ہیں ، جب کہ قرآن شریف میں امانت کا ایک وسیع تصور پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا(النساء ۵۸) ترجمہ:یقیناً اللہ تعالی تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچا دیا کرو۔

مذکورہ آیت کریمہ میں فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ شیبی کو واپس کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ آیت میں امانت کے بجائے صیغہ جمع امانات وارد ہے، جب کہ کنجی کوئی اہم مال تو نہیں ہے۔ وہ تو خانہ کعبہ کی خدمت کی نشانی اور شرف ہے، لیکن اس کا تعلق منصب اور عہدہ سے ہے، لہذا امانات سے مراد امانت کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں جن کی ادائیگی سب مسلمانوں پر لازم کی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ جب ۲۵/ سال کے ہوئے، مکی معاشرہ میں الصادق الامین کا لقب پا چکے تھے، یہی دوصفات ایک اچھے اور سچے مسلمان تاجر کی تجارت کے فروغ کا سبب اور سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہیں، ان صفات کا چرچا عام ہوا تو ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے خود آپ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرا مال تجارت ملک شام کو لے کر جائیں تو میں آپ کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حصہ دوں گی۔ سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا سامان قریش کے کل سامان کے برابر ہوتا تھا۔ وہ مضاربت پر لوگوں کو تجارت کے لئے بیرون مکہ اور شام بھیجتی تھیں۔ اس طرح آپ کے پاس یہ پیغام مضاربت پہنچا تو آپ نے اسے قبول فرمایا، اور اپنے چچا سے اس کا تذکرہ فرمایا تو چچا بہت خوش ہوئے۔ (عیون الاثر لابن سید الناس: ۱/ ۱۱۶۔۱۱۷)

سفر شام کے بعد آپ کی نیک نفسی، راست بازی، صداقت، امانت داری، اور صدق وصفا جیسی صفتیں ظاہر ہوئیں جو کہ تجارت کے اہم اجزاء ہیں، بلکہ ایک تاجر میں نہایت اعلی اخلاق کا پایا جانا ضروری ہے اور رسول اللہ ﷺ انہی صفات سے متصف تھے، مذکورہ صفات سے متاثر ہوکر مکہ کی ذہین وفطین، اور تجربہ کار تاجرہ سیدہ (خدیجہؓ) آپ کی زوجیت میں داخل ہوکر ام المؤمنین کے لقب سے متصف ہوئیں۔

نبی کریم ﷺ نے امت کی تربیت اس طرح فرمائی کہ امت کا ہر فرد سب کی بھلائی کے لیے امانتداری اور دیانتداری کے ساتھ کام کرے، تاکہ دنیا کا نظام بحسن وخوبی انجام پائے۔ خواہ زراعت ہو، یا صنعت وحرفت، تجارت ہو یا درس وتدریس، مساجد کی ذمہ داریاں ہو یا مدارس و اوقاف، سب کام للہ وفی اللہ امت کی مصلحت عامہ کی خاطر ہوں۔ امانت داری ودیانت داری کے ساتھ ہوں تو یہی کام عبادت کے درجے میں ہیں، جیسا کہ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جب کوئی درخت لگاتا ہے اور اسے کوئی آدمی یا جانور کھا جائے تو اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری، :۹۵۸)

تدریسی عملہ اور امانت داری

تعلیم وتدریس یقیناً ایک معزز پیشہ ہے، ہر مذہب اور ہر سماج میں استاذ کو احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، کیونکہ قوموں میں جو بھی بھلائیاں اور خدمت خلق کے جذبے نظر آتے ہیں، یہ سب تعلیم وتدریس کی کرشمہ ہے۔ اسی وجہ سے رب ذوالجلال نے نبوت ورسالت کا مقصد بھی تعلیم وتربیت اور تزکیہ قرار دیا۔ نبی انسانیت کا مربی اور معلم اخلاق ہوتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے (محمد ﷺ کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (اللہ کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔ (سورۃ الجمعۃ ۔۲)

استاذ کی فضیلت وشرف کے لئے عبداللہ بن عمروؓ کی یہ حدیث کافی ہے، نبی کریم ﷺ کا گذر کچھ ایسے لوگوں سے ہوا جو قرآن کریم کی تلاوت، دعا ومناجات میں مشغول تھے، تو کچھ اور لوگ تھے جو پڑھنے اور پڑھانے میں مشغول تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ **وانما بعثت معلما ثم عدل الیھم** ۔ (سنن ابن ماجۃ ۔۲۲۹، الصحیحۃ ۳۵۹۳) یعنی میری بعثت ورسالت کا مقصد ہی تعلیم وتدریس ہے، یہ فرماتے

ہوئے آپ تعلیم وتدریس کے حلقہ کی طرف چلے گئے۔

استاذ کی حیثیت معمار قوم کی ہے، امیر الشعراء احمد شوقی (ت۱۹۳۲) نے ایک قصیدہ میں استاذ کی حیثیت کو اس طرح واضح کیا ہے:

قم للمعلم وفه التبجيلا كاد المعلم أن يكون رسولا

یعنی اپنے استاذ کی مکمل تعلیم وتکریم بجالاؤ، اس لئے کہ اس کا مقام ومرتبہ رسول سے قریب تر ہے۔اس شعر میں رسول سے مجازی معنی مراد ہے،تشبیہ کا مقصد تقریب بین المشبہ والمشبہ بہ ہے۔

امانتداری یہ بھی ہے کہ تدریسی عملہ اپنی ذمہ داری پوری طرح ادا کرے، جو وقت تدریس کے لئے مقرر ہے اس وقت کو صحیح مصرف میں استعمال کرے، مادہ تدریس کا حق ادا کرے، کورس کی تکمیل کے لئے انتھک کوشش کرے، بلا وجہ رخصت طلب نہ کرے، تدریس میں افہام وتفہیم کی ذمہ داری بحسن خوبی انجام دے، جس مادہ تدریس کا حق ادا نہ کر سکے ایسے مادہ کو قبول نہ کرے، مدرسین کو یہ احساس ہو کہ مجھے بھی اللہ کو جواب دینا ہے، دنیا دیکھے یا نہ دیکھے اللہ دیکھ رہا ہے، خیانت کرنے پر روز محشر حساب دینا ہوگا، طلبہ وہی سیکھیں گے جو استاذ نے سکھایا پڑھایا ہے، طلبہ اپنے استاذ کو کتاب پڑھنے سے زیادہ پڑھتے ہیں، استاذ طلبہ کے لئے ایک اچھا ماڈل فکر ہونا چاہئے، اگر استاذ میں خیانت نظر آئے تو طلبہ کی نظروں میں اس استاذ کی وقعت بے قیمت ہو جائے گی۔

جس طرح مادی حقوق کی ادائیگی سے پہلو تہی گناہ ہے اسی طرح بعض حقوق بھی شریعت کی نظروں میں امانت ہیں، ان کی ادائیگی ہر مسلمان پر واجب ہے، جیسے حقوق زوجین، حقوق والدین، حقوق اولاد، نیز استاذ اور شاگرد کے درمیان بھی کچھ حقوق ہیں جو امانت کے درجہ میں ہیں، مثال کے طور پر استاذ کے ذمہ مادہ تدریس امانت ہے کہ وہ شاگرد کو علمی غذا فراہم کرے، تدریس سے قبل تیاری، مطالعہ، پوری محنت سے علمی صلاحیتوں کو طلبہ میں منتقل کرنے کی کوشش کرے، نیز طلبہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ استاذ کو روحانی باپ کا درجہ دیں، خدمت کریں، زندگی بھر اس کے احسان کو یاد رکھیں، عزت واحترام میں فرق نہ آنے دیں خواہ شاگرد ہزار ترقی کر لے، ڈگریاں حاصل کر لے، استاذ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

بعض حضرات تدریس کے میدان میں اہم کتابوں کی تدریس کی ذمہ داری قبول تو کر لیتے ہیں مگر حق ادا نہیں کرتے، اور نہ ہی اس مادہ تدریس کا ان سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ طے شدہ وقت کا ایک تہائی حصہ ضائع کر دیتے ہیں، محض ناموری کی خاطر بڑی بڑی کتابوں کی ذمہ داری قبول کرنا اور حق ادا نہ کرنا بھی مادہ کے ساتھ خیانت ہے، عنداللہ اس کا بھی جواب دینا ہوگا۔

شعبہ ء حفظ اور ثانویہ کے اساتذہ کرام سے ادباً درخواست کروں گا کہ وہ بچوں کو پیار ومحبت کے ساتھ تعلیم دیں۔جسمانی یا روحانی اذیت پہنچانے سے بچ کر اور مجرموں کو سزا دینے کے مروج طریقوں کو خیر آباد کہہ کر قوم وملت کے بچوں پر شفقت کا معاملہ اسی طرح فرمائیں جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری سختی اور سنگ دلی کی وجہ سے بچوں کے دلوں میں علوم شریعت سے نفرت پیدا ہو جائے، اور یہ طالبان علوم نبوت ہمیشہ کے لیے علم سے متنفر ہو جائیں۔نیز بعض مدیران شعبہ جات بعض طلبہ کے ترک تعلیم کا سبب بنے ہوئے ہیں، عہدے کا نشہ ان پر ایسا سوار رہتا ہے کہ وہ کسی ادنی گستاخی کو سبب بنا کر طلبہ کے اخراج کا فیصلہ کر دیتے ہیں، تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیں کہ وہ طلبہ جنھیں خارج کرنے کے فیصلے صادر کئے جاتے ہیں ہماری اولاد ہیں تو ایسی صورت میں یقیناً ہمارا فیصلہ بدل جائے گا، لہذا قوم وملت کے طلبہ کو اپنے طلبہ سمجھ کر انصاف کے

ساتھ صحیح فیصلہ کیا جائے ورنہ ہم سے اللہ کے پاس ضرور پوچھا جائے گا۔

ذمہ داران مدارس اور تقسیم مواد

یہ دور تخصصات کا دور ہے، ہر مادہ میں تخصص پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر فن تفسیر، فن حدیث، علوم قرآن، علوم قراءات، لغت، علوم بلاغت، طرق التدریس، آداب افتاء وقضاء وغیرہ۔ جن اساتذہ نے جن اسباق میں تخصص کیا ہے، اور وہ اس فن میں ماہر ہوگئے ہیں، ایسے اساتذہ کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے، بلکہ اساتذہ کی علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہی علمی مواد کی تقسیم عمل میں آئے، خصوصا مواد کی تقسیم کے وقت قدیم اساتذہ کرام سے مشورہ طلب کیا جائے، مشوروں سے جو بھی کام ہوگا یقیناً وہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

ذمہ داران مدارس پر تقسیم اسباق میں لوگوں کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، ورنہ مادہ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ طلبہ کے مابین اس مدرس اور اس سبجکیٹ سے عدم دلچسپی اور محبت کی جگہ نفرت اور بغض کا ماحول عام ہوگا، بسا اوقات کسی مدرس کو کوئی مادہ اس لئے سپرد کیا جاتا ہے کہ اس کے باپ دادا وہ مادہ پڑھاتے تھے، کیا ضروری ہے کہ بیٹا یا پوتا بھی اس مادہ کا اہل ہو؟ یا اس مادہ کا پورا حق ادا کر سکے؟ علوم شرعیہ کے مدرسین میں تقوی کے ساتھ صلاحیت وصالحیت دونوں لازم ہیں، اس کے بغیر مادہ تدریس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

راقم الحروف کا مشورہ یہ ہے کہ تقسیم مواد کا کلی اختیار دفتر نظامت کو حاصل ہو، جو ایمانداری کے ساتھ مادہ تدریس اساتذہ کی قابلیت وصلاحیت کی بنیاد پر تقسیم کرسکیں، یا ضرورت پڑنے پر دفتر نظامت تقسیم مواد میں بزرگ اساتذہ کے مشورے سے مناسب فیصلہ کرے۔

عہدے اور منصب امانت ہیں

دنیا کے بہت سارے کاموں میں سب سے افضل کام یہ ہے کہ وقف شدہ جائداد کی حفاظت کی جائے اور وقف کرنے والے کی نیت کے مطابق وقف کا صحیح استعمال کیا جائے، ارض موقوفہ کی پاسبانی بھی امانتداری کے ساتھ کی جائے، امانتداری ایمان کا حصہ ہے، خیانت منافقوں کی خصلت وعادت ہے، عام طور پر وقف شدہ جائداد کا صحیح تصرف نہیں ہوتا، واقف کی نیتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، کچھ وارثین وقف شدہ زمین کو اپنی ذاتی جائداد بنا کر اس پر قبضہ کر لیتے ہیں، اور اسے بیچ کر واقف کے حق میں نقصان پہنچاتے ہیں، اللہ کا خوف نہیں رکھتے۔ جب کہ لوگ جس مقصد کے لئے ہبہ یا وقف کرتے ہیں اس کا التزام ضروری ہے۔

عہدہ اور منصب بھی امانتوں میں اہم امانتیں ہیں، اس امانت کو قابل لوگوں میں جو صالحیت کے ساتھ صلاحیت رکھتے ہوں ان کے سپرد کیا جائے، نہ کہ خاندان، وطن، رنگ ونسل یا اپنی من پسند شخصیات کا انتخاب کیا جائے جو اپنے اشاروں پر چل سکیں، مصلحت عامہ سے زیادہ مصلحت خاصہ کو ترجیح دی جائے، یا ایسے شخص کا انتخاب بھی نہ ہو جو پہلے سے کسی خیانت یا بددیانتی میں مشہور ومعروف ہیں۔

بعض معمر افراد اپنے دور کے قابل ترین لوگوں میں شمار تو ہوتے ہیں مگر عمر رفتہ کے ساتھ ان کی تدریس کی طاقت ختم نہیں تو کم ضرور ہوجاتی ہے، کیونکہ پیران سالی کی ہزار مجبوریاں ہوتی ہیں، ان مجبوریوں سے کچھ لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، عمر رسیدہ افراد کو بڑے بڑے عہدے اور منصب پر فائز کرنا بھی انتظام وانصرام کے بگاڑ کا ایک سبب ہے خواہ ان کی تقرری تبرکاً ہی کیوں نہ ہو۔ موجودہ حالات میں جمعیتوں، جماعتوں، ملی تنظیموں اور مساجد ومدارس کے سربراہ اکثر وبیشتر ۷۰/ سال سے زیادہ عمر کی بزرگ شخصیتیں ہی ہیں، ان کی طویل عمر کے ساتھ بیماریاں اور نقل وحرکت کی دشواریاں لامحالہ درپیش ہوتی ہیں، معذور شخصیات کو بطور تبرک بٹھایا جاتا

ہے مگر عملا وہ نہ کچھ کرنے کے مرحلہ میں ہوتے ہیں اور نہ ہی کچھ کرنے کی اجازت دیتے ہیں ، نیز معمر او رجہاں دیدہ شخصیات کے مزاج اور طبیعت میں عمر کے تقاضوں کے ساتھ بڑی تبدیلیاں نمایا ں ہوتی ہیں، ان کے معاونین خصوصاً نوجوان طبقہ ان کا ساتھ نہیں دے سکتا ،عملاً نظام بگڑتا اور درہم برہم ہوجاتا ہے، ناچیز کا مشورہ یہی ہے کہ ان اعلی منصبوں کے لیے عمر کی قید ہونی چائے۔البتہ ہم ان بزرگوں کے مفید مشوروں اور ان کے قابل قدر تجربات سے مستغنی نہیں ہوسکتے لہذا ان سے استفادہ کی گنجائش باقی رکھنی چاہیے۔

ہمارے نظام کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ عہدوں اور منصبوں کے لیے میعاد کی تعیین نہیں ہوتی ،اور بعض معمر افراد تا دم حیات عہدوں سے سبک دوش ہونا نہیں چاہتے ، مثلا کوئی صدر، امیر، ناظم اعلی، سکریٹری، قاضی، صدر مدرس وغیرہ زندگی بھر کے لیے منصبوں پر براجمان ہیں ، گویا ان کے عہدے رجسٹرڈ ہوتے ہیں اور خاندانی وموروثی بھی جب کہ ہم نے عربوں میں دیکھا ہے کہ کسی بھی شخص کو زندگی بھر کے لیے عہدہ نہیں دیا جاتا بلکہ میعاد پہلے سے مثلاً تین سال طے شدہ ہے، کبھی ضرورت پڑنے پر ایک میعاد کا اضافہ ہوتا ہے، ایک اور خوبی میں نے عربوں میں ملاحظہ کی کہ عہدوں اور منصبوں کی وجہ سے ان میں غرور اور تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا الا ماشاءاللہ، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۲۰۱۷ء کے درمیانی سال میں زیارت حرمین شریفین کا موقع میسر ہوا، وللہ الحمد علی ذلک، حسب سابق مادر علمی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی زیارت ہوئی، خیال ہوا کہ کلیۃ القرآن الکریم والدراسات الاسلامیۃ سے گذر ہو ، میرے رفیق درس احمد بن علی بن عبداللہ السدیس کے بارے میں خبر ملی تھی جو رئیس قسم القراءات تھے کہ اب وہ عمید الکلیۃ کے عہدہ پر فائز ہیں، الغرض مبارکبادی پیش کرنے کے لیے ان کے مکتب تک پہنچا تو رفیق درس راقم کو دیکھنے کے ساتھ اپنی کرسی سے فوراً اٹھ کر قریب آ گئے، ہندوستانی طرز پر معانقہ کیا، گرم جوشی اور دلی خوشی کا مظاہرہ کیا، بہت دیر تک پرانی یادوں میں کھو کر حال کی دنیا میں واپس لوٹے، اس دوران عربوں کے انداز میں مہمان نوازی ہوئی، الحمدللہ آج وہ د/احمد بن علی بن عبد اللہ السدیس ہیں ، استاذ کرسی الملک عبد اللہ بن عبد العزیز للقرآن الکریم وعلومہ ہیں، نیز ان کا امام حرم مکی الشیخ د/عبدالرحمن السدیس حفظہ اللہ سے خاندانی تعلق ہے ، الحمد للہ ہمارے قابل قدر اساتذہ میں فضیلۃ الشیخ د/ محمد ایوب برماوی رحمہ اللہ بھی تھے، جو حرمین شریفین اور مسجد قباء میں نماز تراویح پڑھا چکے تھے۔غفراللہ لہ ولوالدیہ۔

عرب کے سسٹم میں ہر قابل شخص کو موقع دیا جاتا ہے جن میں صلاحیت کے ساتھ صالحیت ہوتی ہے، عہدے مال موروث کی طرح منتقل نہیں ہوتے ، کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم اس پہلو پر غور کرتے ،تاکہ ہر قابل شخص اپنی قابلیت کے جوہر دکھا سکے، یہاں بھی قابل لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویران سے
ذرا نم ہوتو یہ مٹی بہت زر خیز ہے ساقی

موجودہ صورت حال

صد افسوس موجودہ دور میں جدھر بھی نظر دوڑائیں بے ایمانی اور خیانت عام نظر آتی ہے ،خواہ وہ اسلامی مراکز ہوں یا جمعیتیں یا جماعتیں یا مکاتب ومدارس وغیرہ جو دینی لحاظ سے اسلامی قلعے تصور کئے جاتے ہیں مگر اکثر وبیشتر قوم کے چندوں سے چلنے والے دینی فلاحی اور رفاہی اداروں پر صرف اجارہ داریاں اور من مانیاں عام ہیں الا ماشاءاللہ، ذمہ داران جو اپنے آپ کو ارباب سمجھتے ہیں ان کی من مانیاں اور خرمستیاں بام عروج پر یا ثریا تک پہنچی ہوئی ہیں، ان ارباب کا قوم سے تعلق صرف چندہ لینے تک ہے، اس کے بعد جن غریبوں اور

ناداروں کے نام سے جو چندے جمع کئے گئے تھے ان پر ان کا استحصال اور استغلال ہوتا ہے، قوم سے جن کاموں کے بہانے زکوۃ وصدقات اور خیرات وصول کئے گئے تھے، ان کا بیشتر حصہ ان کی اور ان کے خاندان کے ملکیت بن جاتا ہے، پھر یہ قوم کی امانتیں انہی ذمہ داروں کے مال موروث بن کر رہ جاتی ہیں الا ماشاء اللہ۔ بعض ذمہ داران مدارس ایسے بھی ہیں جن کی مالی حیثیت دنیا جانتی تھی، مگر آج قوم کے پیسوں سے اور دنیا کی لذتوں سے خوب عیش کرتے ہیں ، جیسے **BMW جیسی** امپورٹ گاڑیوں میں سوار ہوکر قوم کے ساتھ ناروا سلوک کرتے نظر آتے ہیں، جنہیں اللہ کا خوف ہی نہیں ہے، اور نہ ہی روز قیامت حساب وکتاب کا ڈر ہے، اللہ ہدایت دے۔

تصدیق نامہ بھی ایک امانت ہے

ایک بات یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تصدیق نامے جو جاری کئے جاتے ہیں یقیناً یہ بھی ایک امانت ہیں، ہر شخص کو یا ہر ادارہ کو بلا تحقیق تصدیق نامہ جاری کر دینا بھی خیانت ہے، تصدیق نامہ جاری کرنے سے قبل ان مکاتب/ مدارس / جمعیتوں اور جماعتوں/شخصیات کی تفصیلات سے پوری طرح واقفیت ضروری ہے، ورنہ یہ تصدیق نامے جاری کرنے والے ان اداروں کی خیانتوں میں برابر کے شریک اور مجرم تصور کئے جائیں گے، عام طور پر دور دراز کے لوگوں کو بعض ادارے یا معتبر شخصیات تصدیق نامے جاری کر دیتے ہیں مگر ان کے بارے میں صحیح صورت حال سے واقفیت نہیں ہوتی، بعض علاقوں میں مدرسے تو نہیں رہتے مگر صرف بورڈ/ مدرسہ کے نام کی تختیاں لٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں، بعض مدرسے تو قائم ہیں مگر ان سے مستفید ہونے والے مستحق طلبہ کا وجود برائے نام رہتا ہے، بعض ایسے بھی مدرسے ہیں جہاں طلبہ ہی نہیں ہوتے پھر بھی ان کے نام سے ہندوستان بھر میں چندہ وصول کیا جاتا ہے، بعض صباحی اور مسائی مکاتب ہیں ، بعض اسکول ہیں جہاں ایک دو گھنٹے ہی دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں، مگر ان کے چندے ایسے کئے جاتے ہیں جیسے بڑے بڑے جامعات کے لئے چندے جمع کئے جاتے ہیں، مگر ان چندوں کا نہ کوئی حساب وکتاب ہے، نہ کسی کو آمد وصرف کی صحیح خبر ہوتی ہے، ٹرسٹ ہوتے بھی ہیں مگر برائے نام ۔اس طرح کی بے ایمانیاں اور دین وایمان کے نام سے بد دیانتی اور خیانتیں عام ہیں، ان ارباب مدارس ومساجد کو اللہ سے ڈرنا چاہیے، اس لیے کہ حساب وکتاب کا دن آنے ہی والا ہے، اللہ کو پائی پائی کا حساب تو دینا ہی ہوگا۔

اہل مدارس کے لیے ایک مفید مشورہ

دور نبوت میں بعض حضرات زکوۃ وصول کرنے کے لئے بھیجے گئے، جب وہ واپس لوٹے تو کہنے لگے کہ **ھذا لکم وھذا اھدی لی** ،یعنی یہ مال زکوۃ آپ لوگوں کے لئے ہے یعنی بیت المال کا ہے، اور یہ حصہ میرے لئے تحفہ میں ملا ہے، نبی کریم ﷺ فوراً منبر پر تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا بات ہے کہ زکوۃ وصول کرنے والے احباب یہ کہتے ہیں کہ یہ حصہ آپ کا (بیت المال) ہے اور یہ حصہ میرے لئے تحفہ دیا گیا ہے میں اس کا مالک ہوں، **فھلا جلس فی بیت ابیہ و امہ فینظر أیھدی الیہ ام لا** ،فرمایا کہ یہ زکوۃ وصول کرنے والا کیوں نہیں اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھا رہا، پھر دیکھتا کہ وہاں بھی اسے ہدیہ ملتا ہے یا نہیں۔ (صحیح بخاری۔۷۱۷۴)

مذکورہ حدیث کی روشنی میں ناجائز ہدیہ/ تحفہ کی مذمت ثابت ہوئی ، دور حاضر میں زکوۃ وصول کرنے والے احباب اپنے ادارہ کے لئے وصول کرنے سے زیادہ اپنے لئے وصول کرتے ہیں، ادارہ کے خرچ پر آمد ورفت کے باوجود اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے تگ ودو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لہذا راقم کا مشورہ یہ ہے کہ چندہ دینے والے اصحاب خیر حضرات کمیٹی تشکیل دے کر رمضان سے قبل ان اداروں کی

تحقیق وتفتیش کے لئے دورہ کریں اوران سے بینک اکاؤنٹ وغیرہ حاصل کرکے مستند ذرائع سے چندہ بھیجنے کی کوشش کریں، تاکہ چندہ کی پوری رقم اداروں تک پہنچ سکے، نیز چندہ وصول کرنے والے بے چارے روزہ کی حالت میں بہت زیادہ بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں، کہیں نماز تراویح چل رہی ہے اور یہ حضرات مسجد کی آخری صف میں لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے، چندہ جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بعض حضرات بیمار ہوجاتے ہیں، بعض حضرات کی رقم چوری ہوجاتی ہے، ہزاروں مسائل کا سامنا ہے، پھر بھی لوگوں کی زکوۃ و خیرات کا بڑا حصہ کمیشن اور سفر کے اخرجات وغیرہ میں خرچ ہوجاتا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ براہ راست معتبر اداروں کو بینک کے ذریعہ چندہ دیا جائے، یا GOOGLE PAY , PHONE PAY جو آجکل رقم کی ترسیل کے مستند وآسان ذرائع ہیں، ان کو اپنایا جائے، اس طریقہ سے پوری رقم مستحق اداروں کو پہنچے گی، امانتوں میں خیانت بھی نہ ہوگی، دو نمبر کے سفیروں کے مکروفریب سے بھی بچ سکیں گے۔ اصول شریعت یہی ہے کہ زکوۃ وصدقات مستحق لوگوں تک پہنچائی جائے نہ کہ مستحق لوگ دردر کی ٹھوکریں کھائیں اور ذلت برداشت کریں۔

آج بھی قابل قدر محسنوں کی کمی نہیں

جہاں دینی وفلاحی اداروں کے نام پر استغلال عام ہے، خیانتوں کا ارتکاب وسیع پیمانے پر ہے، ایسے لوگوں کے مابین علوم شریعت کی تبلیغ وترویج کے لیے، دعوت الی اللہ کی راہ میں کچھ اللہ والے، دیندار، امانتدار، دین کی خاطر تن، من اور دھن کی قربانیاں پیش کرتے ہوئے، اپنی مملوکہ جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کو فروخت کرکے اور اپنی کمپنیوں کی آمدنی کو ادارہ کی ضرورتوں کی تکمیل اور ترقی کی خاطر پیش کرنے والوں کے وارثین آج بھی موجود ہیں، وللہ الحمد والمنۃ، مطلب یہ ہے کہ مخلصین ومحسنین سے یہ دنیا خالی نہیں ہے، آباء واجداد کی نیک تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لئے انتھک کوشش کرنے والے، ترجیحات دین کو مقدم رکھتے ہوئے، بکھری ہوئی امت کو مقصد تخلیق سے روشناس کرانے کے لئے، مسلک اعتدال جو مزاج شریعت ہے اس کی دعوت واشاعت کی خاطر ہزاروں قربانیاں دیتے ہوئے، بڑے نقصانات کو اللہ کی خاطر خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے، دینی خدمات کو وسیع پیمانے پر کرتے ہوئے، علوم شریعت اور عصری علوم کے حسین امتزاج کو باقی رکھنے کے ساتھ، ہر قدیم جو صالح ہو اور ہر وہ جدید جو جدید نسلوں کے لئے نافع ہو اختیار کرنے والے اللہ والوں کی کوئی کمی نہیں ہے، اللہ تعالی انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے، اور انہی صحت وتندرستی کے ساتھ تادیر دینی خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ **تقبل الله منا ومنهم صالح الأعمال۔**

مساجد کے متولی حضرات

موجودہ دور میں مساجد کمیٹی میں متولی کے منصب کے لئے رسہ کشی اور عہدہ طلبی عام ہے، نااہل لوگ متولی کے عہدے پر براجمان ہیں، اور یہ نااہل لوگ عہدوں سے ناجائز فائدے اٹھاتے رہتے ہیں، متولی کے عہدے کے لئے مثلا مستقل رسہ کشی اور عدالتوں کے چکر نیز افسروں کو بڑی بڑی رقمیں بطور رشوت دینا عام بیماری ہے، تاکہ عہدہ باقی رہے یا عہدہ مل جائے، کہیں ایسا بھی ہے کہ مسجد کی جگہ کسی نے للہ وقف کردی تو کسی نے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا، ایسی مسجدوں پر بعض خاندانوں کا دائمی قبضہ ہے، متولی، سکریٹری اور خازن وغیرہ ایک ہی خاندان کے افراد مستقلا قابض ہیں، بعض مقامات پر جزئی طور پر مسجد کی تعمیر میں شریک ہوکر تا ابد متولی کے منصب پر بعض اہل خانہ قابض ہیں، کئی مسجدیں ایسی ہیں جن کی ضرورتیں عوامی چندے سے پوری ہوتی ہیں، مگر ان کا

حساب وکتاب اللہ ہی جانے۔بعض مساجد کے متولی حضرات وہ ہیں جنہوں نے صرف زمین کا کچھ حصہ وقف کر دیا تھا مگران کا اوران کے وارثین کا مستقل قبضہ اور تسلط ہے،بعض مساجد کے متولی ایسے بھی ہیں جو نماز کے پابند بھی نہیں ہیں،بعض مسجدوں کے اوقاف تو ماشاءاللہ بہت ہیں مگر وقف شدہ جائداد کی آمدنی مساجد پر خرچ ہونے کے بجائے مسجد کمیٹی یا متولی حضرات حقدار بن کر ہڑپ کر لیتے ہیں،کئی مقامات پر تعمیر مسجد کے نام سے عرب وعجم سے خطیر رقم جمع کی جاتی ہے مگر پھر بھی کام ادھورا اور ناقص ہی رہتا ہے،بعض مقامات پر اللہ والوں نے نیک نیتی کے ساتھ بڑی رقم یا جائداد منقولہ وغیر منقولہ وقف کی تھی،مگر اوقاف صحیح مصرف میں استعمال نہیں ہوتے ہیں، مساجد اور اوقاف کی بدقسمتی کہیں یا قرب قیامت کی علامتیں، اکثر وبیشتر مساجد واوقاف پر نااہل لوگ ہی قابض ہیں،بعض مسجدوں کی زائد آمدنی بینک میں FIXED DEPOSIT میں جمع شدہ ہے جس اکاؤنٹ میں سود جمع ہوتا ہے،بعض مسجدوں کی اچھی خاصی آمدنی تو ہے مگر کوئی صحیح مصرف نہیں ہے۔ امام ومؤذن مستقلاً مسکین ہی ہیں۔واللہ المستعان۔

خیانت کے مسائل مساجد،اوقاف،جمعیتوں اور جماعتوں میں بھی عام ہیں الا ماشاءاللہ، نااہل اور غیر متدین شخصیات جبراً وقہراً زمانہ دراز سے قابض ہیں،ایک بار استاذ محترم مولانا خلیل الرحمٰن صاحب عمری رحمہ اللہ کے ساتھ اسلامک فقہ اکیڈمی،انڈیا کی دعوت پر فقہی سمینار میں شرکت کے لئے دہلی سے گذرتے ہوئے ایک جماعت کے ادارہ میں تھوڑی دیر کے لئے رکنے کا اتفاق ہوا،آپ چونکہ ایک بے باک،نڈر اور راست گو عالم تھے،اس لیے جماعت کے ایک ذمہ دار شخص سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ جماعت کے عالی منصب پر اب تک جو بھی فائز ہوئے سب نے ذاتی فائدہ تو اٹھالیا مگر جماعت کی ترقی کے لئے کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔

درحقیقت عوام وخواص میں آخرت کی جواب دہی کا احساس مردہ ہوگیا ہے،بے ایمانیاں عام ہیں،حق گوئی اور بے باکی کو جرم سمجھا جاتا ہے،قوم صرف مفاد پرستی کا ایک وسیلہ ہے، قوم جس مقصد کے لئے چندہ دیتی ہے وہ مقصد پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آتا،اس لئے کہ ان ارباب مدارس ومراکز اور جمعیات کا نظریہ یہی ہے کہ ہم خودمختار ہیں،ہم جیسے چاہیں قوم کے پیسوں کو استعمال کریں،ہم سے کوئی باز پرس نہ کرے،کسی کو کوئی حق ہی نہیں کہ ہم سے حساب وکتاب پوچھے،یہی وجہ ہے کہ یتیموں کے نام سے بنی ہوئی عمارتیں (یتیم خانے) تو ہیں،مگر یتیموں سے خالی ویران وسنسان پڑی ہیں،عرب وعجم کی لاکھوں روپیوں سے بنی ہوئی عمارتیں بنجر زمین کی طرح پڑی ہوئی ہیں، ان کا پرسان حال کوئی نہیں ہے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ امانت کا دائرہ مالی معاملات تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر مالی،قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع مفہوم میں ہے، جب تک امانت کو وسیع مفہوم میں نہیں لیا جائے گا معاشرہ میں بلکہ پوری دنیا میں امن وچین اور سکون میسر نہ ہوگا، بہتر سماج کی تشکیل کے لئے عملا امانتداری کو دیانتداری کے ساتھ جوڑا جائے،آخرت میں جواب دہی کا احساس ہمیشہ زندہ رہے تو خیر امت اپنے فرضی منصبی کی تکمیل کے ساتھ دنیا وآخرت میں سرخ رو ہوگی ورنہ دونوں جہاں میں ناکامی ونامرادی مقدر ہوگی۔ واللہ المستعان،

☆☆☆

❑ تجزیہ

اللہ مؤمن عورتوں پر زیادہ مہربان ہے

ابوفہد ندوی

اللہ تبارک وتعالی نے عورتوں کو کمائی (earning money) سے پوری طرح آزاد رکھا ہے، کمانے کی ساری ذمہ داری مردوں پر ہی رکھی ہے، پھر بھی مجبوری کی صورت میں عورتوں کو گھر سے نکل کر کمائی کے ذرائع اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔ شریعت نے عورتوں کو ان کے خاندان کے کسی بھی فرد کی کفالت کا ذمہ دار نہیں بنایا ہے۔ نہ وہ اس بات کی مکلّف ہیں کہ اپنے بوڑھے والدین کی کفالت کریں، نہ اس بات کی کہ اپنے نسبتی والدین کو اپنے ذاتی پیسے سے کھلائیں پلائیں، حتیٰ کہ خود اپنی اولاد کی کفالت بھی ان کے ذمے نہیں ہے، اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ خود اپنے شوہروں کی کفالت میں ہیں۔ یعنی ان کی تمام جائز ضروریات کا پورا کرنا ان کے شوہروں کے ذمے ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر شریعت نے ان کے لیے یہ کیا کہ انہیں ان کے والد اور شوہروں کی جائداد میں ایک متعین حق دیا۔ ان کے والد اور شوہروں کی یہ جائداد چاہے خواہ ان کی خود کی کمائی ہو یا انہوں نے وراثت میں پائی ہو، اس میں بہرحال زیر کفالت عورتوں کا متعین حق ہے۔ جب شریعت نے یہ چاہا کہ عورتیں پیسہ کمانے کی دوڑ دھوپ سے آزاد اور بے فکر ہوکر اپنے گھروں کی آرائش وزیبائش میں لگیں اور اپنے بچوں کی پرورش کریں تو لازماً شریعت کو انہیں یہ رخصت دینی ہی تھی کہ ان پر کسی بھی فرد کی کفالت کا ذمہ نہ ہو، مزید برآں انہیں گھر کے کاموں کی خدمت کے صلے میں والد اور شوہر کی جائداد میں حصہ بھی ملے۔ جو عورتیں صاحب حیثیت ہیں وہ اپنی خوشی سے اپنے بچوں، والدین، بھائی بہن اور شوہر پر جتنا چاہیں خرچ کرسکتی ہیں مگر وہ اس کی مکلّف نہیں ہیں۔ جس طرح شوہر اس کا مکلّف ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو کھلائے پلائے اور ان کے علاج معالجے پر پیسہ خرچ کرے۔ اگر وہ پھر بھی ایسا کرتی ہیں تو یہ ان کی طرف سے احسان ہے۔

جن عورتوں کے خاوند فوت ہوگئے ہیں اور وہ محنت مزدوری کرکے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں، انہیں تعلیم دلاتی ہیں، یقیناً ایسی عورتیں اللہ کی نظر میں بڑا درجہ رکھتی ہیں اور ان کے لیے اللہ کے یہاں بڑا اجر ہے۔ ایسی عورتیں معاشرے میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھی جانے کی مستحق ہیں، بنسبت ان عورتوں کے جو موروثی طور پر صاحب ثروت ہوں اور انہیں اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے محنت مزدوری کی حاجت نہ پڑے۔ بے شک ان کے لئے بھی نیکیاں کمانے کے بہت سے راستے

ہیں، ضعیفوں اور کمزوروں کی مدد اور ان کا مالی تعاون کرنا، موروثی طور پر صاحب ثروت عورتوں کے لیے ایک اضافی موقع ہے، جب کہ دیگر کے پاس دو ہی مواقع ہیں: ایک عبادت اور دوسرے خدمت۔ مگر یہ بڑے درجے کی بات ہے کہ کسی عورت کا خاوند فوت ہو گیا ہو، یا بیمار ہو یا اور کوئی مجبوری ہو اور وہ عورت کم از کم شریعت کے بنیادی اور اساسی احکام کی پابندی کرتے ہوئے محنت ومزدوری یا ملازمت کر کے حلال روزی کمائے اور اپنے بچوں کی پرورش کرے۔ ایسی عورت ہر طرح سے انعام واکرام کی مستحق ہے؛ کیونکہ ایسا کر کے نہ صرف یہ کہ وہ اپنے بچوں کو پال پوس رہی ہے اور پڑھا لکھا رہی ہے، بلکہ مسلم معاشرے کو معاشی اور علمی سطح پر مستحکم کرنے میں بھی اپنا سا رول ادا کر رہی ہے۔

بچوں کی پرورش اور گھر گرھستی کے کام کاج بھی بڑے کام ہیں؛ بلکہ تھکا دینے والے کام ہیں۔ اگر عورتیں یہ سب کام خوش دلی اور محنت ولگن کے ساتھ کرتی ہیں تو ان کے لیے اللہ کے یہاں بڑا اجر وثواب ہے۔ مرد حضرات اپنی عورتوں کے آرام وراحت کے لیے بھلے ہی زیادہ نہ سوچیں اور بھلے ہی وہ ان کی طرف سے بے پروا بنے رہیں، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی طرف سے بالکل بھی بے پروا نہیں ہے۔ اللہ کو خود ان کا، ان کے کاموں کا اور انسانی معاشرے کی تعمیر وتشکیل میں ان کی بنیادی ذمہ داریوں اور عملداریوں کا، ان کے درد کا اور ضعف کا، پھر ان کے ذمے جو کام ہیں ان کی مشکلات کا اور نزاکتوں کا خوب خوب علم ہے۔ آخر اللہ علیم وخبیر ہے اور اسی کا فرمان ہے ''أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ'' جس نے پیدا کیا ہے، کیا وہی اپنی تخلیق (انسان) کے بارے میں نہ جانے گا؟۔ کیوں نہیں۔

وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الملک) بے شک اللہ جانتا ہے اور خوب جانتا ہے۔

اسی لیے اللہ نے اپنی شریعت میں مسلم خواتین کے لیے بہت ساری رخصتیں رکھی ہیں۔ ان رخصتوں کو مرد حضرات ان کے لیے کمزوری، عیب، بلکہ ان کے لیے بے وقعتی تصور کر رہے ہیں۔ اور ان پر ناقصات العقل والدین کی پھبتی کستے رہتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ ان الفاظ سے رسول اللہ ﷺ کی واقعی منشا ومراد کیا تھی۔ ناقصات العقل والدین والی حدیث کی وضاحت میں شیخ ابن بازؒ فرماتے ہیں:

''ولا يلزم من هذا أن يكون نقص عقلها في كل شيء، ونقص دينها في كل شيء. وإنما بين الرسول ﷺ أن نقص عقلها من جهة ما قد يحصل من عدم الضبط للشهادة، ونقص دينها من جهة ما يحصل لها من ترك الصلاة والصوم في حال الحيض والنفاس، ولا يلزم من هذا أن تكون أيضا دون الرجل في كل شيء، وأن الرجل أفضل منها في كل شيء۔''

''اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورت ہر معاملے میں کم فہم ہے اور ہر دینی عمل میں اس کے لیے رخصت (نقص) ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمادی ہے کہ شہادت کے معاملے میں اس کے نقص کی علت شہادت کو درست طور پر محفوظ نہ رکھ پانا ہے اور دینی امور میں نقص کی علت یہ ہے کہ مخصوص ایام میں اس کی نمازیں معاف کر دی گئی ہیں اور روزے مؤخر کر دیے گئے ہیں۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورت ہر معاملے میں مرد سے کمتر ہے اور مرد ہر معاملے میں عورت سے برتر ہے''۔

وہ سمجھتے ہیں کہ دو عورتوں کی گواہی کا ایک مرد کی

گواہی کے مساوی ہونا، انہیں نمازوں اور روزوں میں رخصتوں کا ملنا، اسی طرح ان کا صاحبِ کفالت نہ ہونا بلکہ خود مردوں کی کفالت میں ہونا، مساجد وعیدگاہوں میں جانے کے لیے رخصتوں کا رکھا جانا، یہ سب شرعی احکام عورتوں کی عظمتوں کو گھٹاتے ہیں اور مرد کے مقابلے میں انہیں کم تر ثابت کرنے کے لیے کافی وجہ جواز رکھتے ہیں۔ لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ اللہ نے عورتوں کی عظمتوں میں کچھ کمی نہیں کی ہے۔ البتہ ایسا ضرور ہے کہ اللہ نے یہ کائنات فطری یا تخلیقی فرق کے ساتھ بنائی ہے، یہاں ایک کمزور ہے اور ایک طاقتور ہے، ایک انگلی چھوٹی ہے اور دوسری بڑی ہے، دماغ کی ساخت اور اس کے اعمال بالکل الگ ہیں اور دل کی ساخت اور اس کے اعمال بالکل مختلف ہیں۔ یہی فطری یا تخلیقی فرق اللہ نے ہر ایک جنس اور نوع میں رکھا ہے، خواہ وہ جاندار ہو یا غیر جاندار ہو، اسی طرح ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان رکھا ہے اور جس طرح ایک مرد اور دوسرے مرد اور ایک عورت اور دوسری عورت کے درمیان رکھا ہے، اسی طرح اللہ نے یہی فطری وتخلیقی فرق مرد اور عورت کے درمیان بھی رکھا ہے۔ اور اس سے اللہ کی منشا کسی کی اہمیت کو گھٹانا اور بڑھانا نہیں ہے بلکہ دنیا کے کاروبار کو احسن طریقے پر چلانا ہے۔ اگر ذمہ داریاں اور عہدے مختلف نہیں ہوں گے تو کوئی بھی کام پائے تکمیل کو نہیں پہنچ پائے گا۔ نہ عمارتیں تعمیر ہوسکیں گی، نہ کھیت کھلیانوں میں رونقیں رہیں گی اور نہ ہی نسلیں پروان چڑھیں گی۔ اس کے علاوہ اللہ نے ہر ایک کے ذمے وہی اعمال لگائے ہیں جنہیں وہ بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے اور اپنی بنیادی ذمہ داری کو متاثر کیے بغیر انجام دے سکتا ہے۔

مرد وعورت، دونوں میں سے ہر ایک کی کچھ بنیادی ذمہ داریاں ہیں اور کچھ اضافی۔ دنیا کے کاروبار کو مستقل اور مسلسل رکھنے کے لیے خاندان کی سطح پر عورتوں کی بنیادی ذمہ داری بچوں کی پیدائش اور پرورش ہے، جبکہ مردوں کی ذمہ داری گھر کے باہر کے محنت ومشقت والے کام ہیں۔ اسلام کی یہ تقسیم عمومی نوعیت کی ہے نہ کہ کلی نوعیت کی، جزوی اعتبار سے اس میں فرق واقع ہوسکتا ہے، جزوی طور پر یہ تقسیم الٹ بھی سکتی ہے، ایک مرد گھر کا کام کاج بھی کرسکتا ہے اور ایک عورت باہر کا کام کاج بھی سنبھال سکتی ہے۔ اور یہ سب وقت اور حالات پر منحصر ہوگا۔ اگر عورتوں کو پرامن ماحول میسر ہو، بطور خاص اسلامی ماحول میسر ہو، ان کی عزت وآبرو محفوظ ہو اور ان کے جان ومال کو کوئی خطرہ نہ ہو تو ان کے لیے باہر کے کام کرنے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ ان پر دوہری ذمہ داری نہ آن پڑے۔

اس کے علاوہ مرد وعورت دونوں کی جو اضافی ذمہ داریاں ہیں وہ مختلف اور متنوع ہیں، مگر یہ ذمہ داریاں ان کی بنیادی ذمہ داریوں کو سپورٹ کرنے والی ہیں۔ اللہ نے عورتوں کو گھر گرہستی سنبھالنے کی جو اضافی ذمہ داری دی ہے وہ ان کی بنیادی ذمہ داریوں یعنی بچوں کی پیدائش اور پرورش کو پورا کرنے اور بحسن وخوبی ادا کرنے میں معاون ہے۔ بچوں کی پیدائش اور پھر پرورش شاید دنیا کا سب سے مشکل اور نازک کام ہے۔ عورتیں جتنی زیادہ سوجھ والی، پڑھی لکھی اور دیندار ہوں گی وہ اپنے بچوں کی پرورش اتنے ہی زیادہ بہتر طریقے پر کرسکنے کی اہل ہوں گی۔ اگر عورتوں پر انسانی نسل آگے بڑھانے کی بنیادی ذمہ داری نہ ہوتی تو پھر ان کے ساتھ جو فطری امور لگے ہوئے ہیں وہ بھی نہ ہوتے اور پھر ان کے مخصوص شرعی احکام بھی نہ ہوتے۔ پھر تو بہت ساری چیزیں نہ ہوتیں۔ اس کا مطلب یہی ہے

کہ ان کی اسی ایک بنیادی ذمہ داری کے اردگرد خاندان کا سارا معاشرتی، معاشی اور اخلاقی سسٹم گھوم رہا ہے۔ اور اسی پر ان کے جسمانی نظام کی بنا ہے۔

عورتوں کا جسمانی نظام، جو تھوڑا بہت مردوں سے مختلف ہے، اللہ نے اسے بھی ان کی اسی ایک بنیادی ذمہ داری کو مدنظر رکھ ہی تخلیق کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اسی بنیادی ذمہ داری کو سپورٹ دینے کے لیے اللہ نے اسلامی شریعت میں مسلم خواتین کے لیے بہت سی رعایتیں رکھی ہیں اور آخری حد تک انہیں سہولتیں عطا کی ہیں۔ مرد کے لیے مساجد میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا جبکہ عورتوں کے لیے ان کے گھروں میں ہی نماز ادا کرنے کو بہتر بتایا، مردوں کو محنت ومشقت اور دوڑ دھوپ والے کام دیے جبکہ عورتوں کو معاشی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ رکھا۔ ان کے سپرد ایسے کام کیے جنہیں وہ موسم کی سختیوں کو جھیلے بغیر اور دوڑ دھوپ کی مشقتوں سے بچتے ہوئے، کسی قدر اطمینان اور آرام سے رہ کر انجام دے سکیں۔ اور کام کاج کے ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش پر بھی اچھی طرح دھیان دے سکیں۔ اللہ نے فطری اور شرعی طور پر مسلم خواتین کے لیے جو آسانیاں فراہم کی ہیں اور جو ذمہ داریاں انہیں دی ہیں ان سب میں عورتوں کے لیے ترحم اور سہولیات کا پہلو نکلتا ہے۔ عورتوں کے مقام ومرتبے کو گھٹانے کا پہلو کسی طرح بھی نہیں نکلتا۔ رسول اللہ ﷺ سے جہاد میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ حج ہی ان کا جہاد ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث بخاری ومسلم میں آئی ہے اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ عورتوں پر بہت مہربان ہے، اللہ ان کو اضافی مشقتوں میں نہیں ڈالنا چاہتا اور انہیں ایسی خدمات پر مأمور نہیں کرنا چاہتا جو فطرتاً ان کے لیے موزوں نہ ہوں، اللہ نے ان کے لیے فضیلتوں اور ثواب میں کمی کیے بغیر انہیں یہ سب رخصتیں دی ہیں اور ایسا کرنے میں خود انھی کی بھلائی اور آسانی اللہ کے پیش نظر ہے۔

مگر بدقسمتی سے ہوا یوں ہے کہ عورتوں کے لیے اسلامی شریعت میں رکھی گئی سہولیات کو لوگوں نے، اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی، عورتوں کے خلاف سمجھ لیا اور ان کو ایک طرح سے عورتوں کی حق تلفی قرار دیا۔ یہ رویہ اچھی چیزوں سے برے معانی پیدا کرنے جیسا ہے۔ عورتوں کو گھروں میں رہنے کی اضافی تاکید ہو، ان کے لیے پردہ کا حکم ہو، گھروں میں نماز پڑھنے کے جواز بلکہ فضیلت کی بات ہو، غیر محرم اور اجنبی لوگوں سے ملنے سے احتراز اور خاص طور پر تنہائی میں ملنے کی ممانعت ہو، یہ سب ان کے لیے تحفظ، سہولیات اور بہتر سے بہتر ماحول فراہم کرنے کے نقطۂ نظر کے سبب سے ہے۔ یہ کسی کی فضیلت گھٹانے یا بڑھانے کی وجہ سے نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ نے صاف اعلان فرمایا دیا۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُم [الحجرات:13] [اللہ کے نزدیک زیادہ معزز ومحترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت]۔

رسول اللہ ﷺ نے آخری خطبے میں عورتوں اور غلاموں کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی معاشرتی زندگی میں یہ دو طبقات سب سے زیادہ کمزور رہے ہیں، ان کا ہمیشہ سے استحصال ہوتا رہا ہے۔ گھریلو ہنسا (Domestic Vilance) کی شکار زیادہ تر عورتیں ہوتی ہیں یا پھر بچے اور گھروں کے ملازم۔ ہمارے اِس مرد اساس معاشرے میں جو غالب قوت ہے وہ مرد کی ہے، مرد جسمانی طور پر بھی مضبوط ہوتا ہے، مزید یہ کہ دنیا کا معاشرتی سسٹم بھی مرد ہی کو زیادہ سپورٹ کرتا ہے اور عورت کے مقابلے میں وہ مرد کی طاقت کو زیادہ بڑھاتا ہے۔ کسب معاش

انسانی حیات کے لیے اسی طرح ہے جس طرح جسم کے لیے روح اور کسب معاش کے ہر میدان میں مرد کو توفق حاصل ہے، اس باعث مرد کے لیے یہ کافی آسان ہوجاتا ہے کہ وہ عورتوں کو من چاہے طریقے پر ستائے اور عورتوں کے لیے یہ مجبوری بن جاتی ہے کہ وہ ظلم وزیادتی سہتی رہیں۔ بس اسی خدشے کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات کے قریبی وقت میں بھی خاص طور پر عورتوں کا ذکر کیا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کی۔

رسول اللہ ﷺ ظاہر ہے یہ تو نہیں کر سکتے تھے کہ وہ عورت کو مرد بنا دیتے یا اسے بھی اتنا ہی طاقتور بنا دیتے جتنا کہ مرد ہے، یہ تو کوئی بھی نہیں کرسکتا، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو دنیا کی کوئی بھی طاقت نہیں بدل سکتی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ کیا کہ عورتوں کے معاملات میں مرد کو قانونی اور اخلاقی بندشوں سے باندھ دیا تاکہ وہ ظلم سے باز رہے اور عورتیں مردوں کے گھروں میں محفوظ و مامون رہ سکیں۔

بالکل اسی طرح جس طرح ہر ملک کے اپنے قوانین ہوتے ہیں، حکومتیں ہوتی ہیں، پارلیمنٹ ہوتی ہے اور عدالتیں ہوتی ہیں۔ اب یہ حکومتیں، پارلیمنٹ اور عدالتیں یہ تو نہیں کرسکتیں کہ وہ اپنے ملک کے لوگوں کو یکساں طاقتور بنا دیں، عورتوں کو بھی مردانہ قوت ووجاہت دے دیں، اس لیے انہوں نے قوانین بنا دیے، عدالتوں میں جج بٹھا دیے اور کمزوروں کے لیے ایک متبادل طاقت فراہم کردی تاکہ وہ کمزوروں کے ساتھ کھڑی رہے۔ اور جب بھی کوئی طاقت ور آدمی کسی کمزور آدمی پر ظلم کرے تو کمزور اپنی پشت پر اخلاق اور قانون کی طاقت کھڑی ہوئی محسوس کرے۔ اور ایک کمزور شہری اس طاقتور شہری سے قانون اور عدالت کے سہارے اپنا حق وصول کرلے اور وہ اسے بھی اسی طرح کی تکلیف سے دوچار کردے جس طرح کی تکلیف سے طاقتور آدمی کے ذریعہ خود اسے گزرنا پڑا تھا۔

یہی عمل شریعت اسلامی نے کیا ہے، اس نے مرد کی ظالمانہ روش اور بے لگام غیض وغضب کو لگام لگانے کے لیے، اسلامی اخلاق وقوانین میں باندھ دیا ہے۔ اگر اسلامی قوانین کسی ملک میں پوری طرح نافذ ہوں اور ان کے ساتھ قوت نافذہ بھی ہو تو ظالم سے ظالم مرد بھی بلکہ شیطان بھی ان قوانین کے ہوتے ہوئے، کمزور مردوں، غلاموں اور عورتوں کو ستانے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور جو مسلمان مرد اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے لیے کسی طرح کی قوت نافذہ اور فوجداری قوانین کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ان کے لیے اخلاقی قوانین ہی بہت ہیں۔ ان کے لیے ہر طرح کے ظلم سے باز رہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی پکڑ سے ڈرتے ہیں۔ اسی ضمن میں مردوں کے لیے اللہ کا یہ حکم بھی ہے: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ [النساء:19] اور نبی ﷺ کا یہ فرمان بھی: استوصوا بالنساء خیراً۔ اور یہ بھی: النساء شقائق الرجال [رواہ البخاری (3331) ومسلم (1468)] یعنی عورتیں مردوں ہی کے مثل ہیں۔ اس کا صاف مطلب ہوا کہ تخلیق میں اور حقوق میں مرد وعورت کے درمیان کچھ فرق نہیں، جس طرح دو مردوں کی تخلیق اور حقوق میں کچھ فرق نہیں۔

مرد اور عورت، دونوں کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا گیا ہے، دونوں ہی تخلیق میں برابر سرابر کی اہمیت کے حامل ہیں اور نہ صرف ان کی خود کی تخلیق میں بلکہ روئے زمین پر انسانی نسل کے بقا وتحفظ میں اور پرورش میں بھی دونوں برابر کے حصے دار ہیں، بلکہ اللہ کے تخلیقی پلان کی

تکمیل میں برابرسرابر کی ذمہ داری نبھانے والے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: یـااَیُّهَـا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَـرٍ وَّ اُنْثٰـی [النساء:1] اس آیت میں آدم وحوا کی تخلیق کے بعداللہ نے دنیا میں جوتخلیقی عمل جاری وساری کیا ہے، اس کا بیان ہے۔اور اس بیان کی غایت یہ ہے کہ جب تمام انسان (مردوعورت) ایک مرداورایک عورت سے پیدا ہوئے ہیں تو ان میں کسی طرح کی کوئی تفریق کیسے روا رکھی جاسکتی ہے؟ دونوں کی تخلیق دونوں کے اجتماعی عمل سے وجود پذیر ہوئی ہے اور دونوں ہی روئے زمین پر اللہ کے تخلیقی منصوبے کو جاری ساری رکھنے میں یکساں عملداری رکھتے ہیں۔

کوئی بھی قانون ہو، اس کا بنیادی مقصد کمزورانسانوں کے حقوق کو پامالی سے بچانا ہے۔ معاشرے میں جوطاقتورفرد ہے وہ تو مخالف کی ناک توڑ کر اپنا حق خود ہی حاصل کرلے گا مگر جو کمزور ہے وہ طاقتور سے اپنے حقوق نہیں لے سکتا۔دنیا میں اسی لیے قانون بنائے جاتے ہیں، قانون کی بنیادی شق یہی ہے کہ وہ کمزور کے ساتھ کھڑا رہے۔اللہ کی شریعت بھی اخلاق وقوانین کا مجموعہ ہے۔قرآن میں تاریخ، واقعات، حکمت، موعظت، سائنس اورغیب کی باتوں کے علاوہ اخلاق وقوانین بھی ہیں۔اور قانون کے اساسی ہدف کوسامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہے کہ قرآن کمزوروں کے لیے ہے اور ہمیشہ کمزوروں کے ساتھ کھڑا ہے۔اسی لیے قرآن میں امن اور انصاف قائم کرنے کی بات بار بار دہرائی گئی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ جب خلیفہ بنائے گئے، اس وقت انہوں نے جو پہلا خطبہ دیا ہے، ذرا اس کے یہ عظیم الشان الفاظ دیکھیں:

''أَيُّهـا الـنـاسُ فَـإِنـی قد وُلِّيتُ عليكم ولست بـخيـركـم فإِنْ أَحسَنْتُ فَأَعِينُونِی وإِنْ أَسَأْتُ فَقَوِّمُونی .الصِدْقُ أمانةٌ والكَذِبُ خِيَانَةٌ . والـضـعيفُ فيكـم قویٌّ عندی حتی أرجعَ إليه حـقَّـه إن شاء اللّه، والقویّ فيكم ضعيفٌ عندی حتی آخـذَ الـحـقَّ منه إن شاء اللّه ''۔[سیرۃ ابن ہشام:4/240،عیون الأخبار لابن قتیبۃ:2/234.]

''اے لوگو! مجھے تمہارے معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔تو اگر میں اچھا کروں تو میرا تعاون کرو اور اگر میں غلطی کروں تو میری رہنمائی کرو اور مجھے درست کردو۔سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقتور ہے، یہاں تک کہ میں اسے اس کا حق دلا دوں اور جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے کمزور کا حق لے کر کمزور کو لوٹا دوں۔ان شاء اللہ''

اس خطبے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بنیادی اہداف میں ایک بڑا ہدف اور خلیفۃ المسلمین کی اساسی ذمہ داریوں میں ایک بڑی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ مسلمان رعایا میں انصاف قائم کیا جائے اورظالم ومغرور انسانوں سے کمزور وغریب انسانوں کے حقوق دلوائے جائیں۔اب اگر کسی مسلم معاشرے میں عورتوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں تو اللہ، اللہ کا قانون یعنی قرآن ہمیشہ ان کے ساتھ کھڑا ہوا ہے۔اب اس کے بعد جو کچھ رہ جاتا ہے وہ اسلام کے احکام کو مسلم معاشرے میں نافذ کرنے کی عظیم ذمہ داری رہ جاتی ہے۔

☆☆☆

❑ وفیات

ہماری یاد جب آئے تو دو آنسو بہا دینا

(آہ استاد محترم مولانا نذر الحفیظ ندوی از ہریؒ!)

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(امام بخاری ریسرچ اکیڈمی علی گڑھ)

۱۵ شوال ۱۴۴۲ھ مطابق ۲۸ رمئی ۲۰۲۱ء بروز جمعہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سینئر ترین استاد اور صدر شعبۂ عربی، استاد محترم مولانا نذر الحفیظ ندوی از ہری ۱۲ رج کر ۵۵ رمنٹ پر بوقت جمعہ مختصر سی علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ استاد محترم کی رحلت کی خبر سے نہ صرف آنکھیں روئیں؛ بلکہ دل بھی رو پڑا:

دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

آہ! کیسے یقین کروں کہ استاد محترم اب اس جہان رنگ و بو میں نہیں رہے۔ ان کی شفقت وعنایت سے محرومی کا احساس آنکھوں کو بار بار بھگو دے رہا ہے۔ ان کی یادیں اور باتیں رہ رہ کر یاد آرہی ہیں اور آنکھوں کو بے اختیار کر دیرہی ہیں۔

اس اٹل حقیقت کے باوجود کہ *یہ دنیا انسان کا دائمی نشیمن نہیں*، پھر بھی بعض لوگوں کی موت سے سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ اگر مرنے والا آپ کا محسن ہو تو، اس کا دکھ اور زیادہ محسوس ہوتا ہے؛ لیکن اگر محسن ہونے کے ساتھ وہ آپ کا استاد و مربی ہو، وہ شفیق باپ سے زیادہ آپ کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کرتا رہا ہو، وہ آپ کی کامیابی سے نہ صرف خوشی محسوس کرتا رہا ہو؛ بلکہ آپ کی ترقی و بلندی کا دل سے متمنی رہا ہو، تو ایسا نسان کی موت بہت رلاتی ہے۔ استاد محترم کی رحلت سے پہنچنے والے صدمے کی نوعیت کچھ اسی قسم کی ہے۔

استاد محترم سے واقفیت کی ابتدا:

استاد محترم کے نام سے کان اسی وقت آشنا ہوگئے تھے، جب میں ۱۹۹۹ء میں شمالی بہار کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ اسلامیہ (شکر پور، بھروارہ، دربھنگہ) میں حصول علم کے لیے حاضر ہوا۔

پھر جب ۲۰۰۳ء میں پرتاب گڑھ کے مشہور قصبے کنڈہ میں واقع دار العلوم ندوۃ العلماء کی مشہور وممتاز شاخ مدرسہ نور الاسلام میں تعلیم کی غرض سے حاضر ہوا، تو وہاں فضلائے ندوہ کے کاموں اور ان کی علمی خدمات سے واقف ہونے کا خوب موقع ملا۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ استاد محترم کی مشہور ووقیع کتاب ''مغربی میڈیا اور اس کے اثرات'' پر ادھر ادھر سے نظر ڈالی۔ کبھی کبھی تعمیر حیات میں ان

کے مضامین بھی نظر سے گزرتے ،اور اپنی بساط بھر دامن مراد بھرنے کی کوشش کرتا۔

استادمحترم سے استفادے کی مختلف شکلیں

پھر جب ۲۰۰۵ء کے اواخر اور ۲۰۰۶ء کے اوائل میں دارالعلوم ندوۃ العلما پہنچا، تو وہاں کی علمی وادبی فضا دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔اور کیوں نہ ہوتی کہ مدتوں بعد میرے نخل تمنا کو شاداب اور نہال ہونے کا موقع مل رہا تھا۔میں نے مکمل کوشش کی کہ ندوۃ العلما کے علمی وادبی ماحول سے اچھی طرح فائدہ اٹھاؤں۔ وہاں کے اساتذہ ومعلمین سے خوب خوب کسب فیض کروں؛ کیوں کہ ہمارے اساتذہ نے بچپن ہی سے یہ بات ذہن نشیں کرادی تھی کہ دنیا میں ہر مسافر کے لیے آرام ہے؛لیکن مسافر علم کے لیے راحت حرام ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا امین الدین شجاع الدین مرحوم اپنے امراض وعوارض کی بنا پر تعمیر حیات کی ایڈیٹری سے الگ ہوگئے تھے، اور اس وقت مدیر مسئول کی حیثیت سے استادمحترم مولانا نذرالحفیظ ندوی صاحب تعمیر حیات کے معیار ووقار کو بلند کرنے میں مشغول تھے۔اس دوران کثرت سے تعمیر حیات میں ان کے مضامین پڑھنے کو ملے اور بقدر ظرف واستعداد خوب خوب فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی۔

۲۰۰۶ر میں جب ندوۃ العلما کے معتمد تعلیم اور تعمیر حیات کے نگراں مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ کا انتقال ہوا، تو تعمیر حیات نے ان کی شخصیت پر خاص نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا،اس نمبر کے بعض مضامین کی پروف ریڈنگ کا موقع مجھے بھی ملا۔اس خاص نمبر کی جب اشاعت ہوئی تو اس کے حسن ترتیب سے استادمحترم کی سلیقہ مندی کا جوہر اور ان کا صحافتی وجمالیاتی ذوق کھل کر سامنے آیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلما میں مجھے 5 / برس گزارنے کا موقع ملا۔ اس پورے دورانیے میں استادمحترم سے استفادے کی مختلف شکلیں نکلتی رہیں۔کبھی کسی موقع سے ان کا محاضرہ ہوتا۔کبھی النادی العربی کے اسٹیج سے مستفید فرماتے۔کبھی عشابعد کی مجلس میں وہ حضرت ناظم صاحب کی علم پرور صحبتوں سے مستفید ہونے کے مواقع مہیا کرتے۔اکثر ایسے سوالات کرتے،جن سے ہم طالب علموں کو بڑا فائدہ پہنچتا۔اس طرح تین برس کا عرصہ گزر گیا؛لیکن باضابطہ آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

استادمحترم سے باضابطہ شرف تلمذ

۲۰۰۸(۱۴۲۹ھ) کے اواخر میں تخصص فی الادب کرنے کا جب میں نے فیصلہ کیا،تو قسمت نے یاوری کی اور استادمحترم سے باضابطہ شاگردی کی سعادت ملی۔اور میں مکمل دو برس تک ان کے چشمہ ؟ علم سے سیراب ہوتا رہا اور اپنے شجر علم کو شاداب کرتا رہا۔

پہلے سال میں استادمحترم سے ''الأدب المرسل'' کے عنوان سے ''رنّات المثالث و المثانی للأصفهانی'' اور ''إذا هبت ریح الإیمان للندوی'' اور ادب اسلامی اور نقد ادب پر عالم عرب کے مشہور ادیب وناقد ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا کی وقیع کتاب ''نحو مذهب إسلامی فی الأدب والنقد'' کے منتخب اسباق پڑھنے کی سعادت ملی، جب کہ سال دوم میں دو اہم موضوعات ''علم النفس والاجتماع'' اور ''استشراق ومستشرقین'' پر ان کے قیمتی محاضرات ہوئے،جن کو مکمل قلم بند کرنے کا موقع ملا۔

استادمحترم کا پہلا درس_ کچھ یادیں، کچھ باتیں:*

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۹ر اکتوبر ۲۰۰۸ کی تاریخ تھی اور علیا اولی ادب کا سال تھا جب درس دینے کے

لیے استاد محترم درس گاہ میں پہلی بار تشریف لائے۔آپ نے آتے ہی ادب مرسل پر کچھ دیر گفتگو فرمائی۔پھر''الأغانی'' کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

''ابوالفرج اصفہانی کی کتاب''الأغانی'' زبان وادب کا بہترین نمونہ ہے۔یہ اپنی فصیح عربیت،ادبی شان،حسن تعبیر، اصفہانی کے بیان کی قدرت اور احساسات وجذبات کی شاندار ترجمانی کے لیے جانی جاتی ہے۔یہ عہد عباسی کی ان تصنیفات میں سے ایک ہے جو غیر مصنوعی ادب(ادب مرسل) کی نمائندہ مانی جاتی ہیں۔اس کتاب میں موسیقی، ثقافت اور زمانہ؟ جاہلیت اور ابتدائے اسلام کے عربی آداب ورسوم کا جامع نقشہ کھینچا گیا ہے؛لیکن نقشہ اس انداز سے کھینچا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ تأثر ملتا ہے کہ اسلامی معاشرہ گانے بجانے کا معاشرہ تھا۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ اسلامی معاشرے کی مسخ شدہ تصویر ہے۔یہی وجہ ہے کہ مخالفین اسلام کے نزدیک اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔اسی کتاب کو بنیاد بنا کر عیسائی مؤرخ جرجی زیدان نے اپنی مشہور زمانہ کتاب''تاریخ التمدن الإسلامی''لکھی،جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی معاشرہ گانے بجانے کا حلیف اور مؤید تھا۔جرجی زیدان کی جب یہ کتاب منظر عام پر آئی،تو علامہ شبلی نعمانیؒ کی رگ حمیت پھڑک گئی،اور انھوں نے''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' کے نام سے ایک تنقیدی کتاب لکھی،اور جرجی زیدان کے پھیلائے ہوئے زہر کو بڑی حد تک ختم کر دیا''۔

پھر فرمایا:

''اغانی کا یہ کمزور پہلو حضرت مولانا(علی میاں ندویؒ) کے سامنے بھی واضح تھا۔ان کو بڑا افسوس تھا کہ اصفہانی کا سحر طراز اور ادبی قلم کیسے اغانی کی وادی میں جا پڑا،اور کیسے انھوں نے اپنے اس علمی اودبی شاہ کار کو گھٹیا مقاصد(یعنی گانے بجانے،دھن اور سر وغیرہ) کے لیے استعمال کیا۔اسی خیال نے حضرت مولانا کو آمادہ کیا کہ قصصی اسلوب میں ایک ایسی کتاب تیار کی جائے،جس میں اغانی کے اسلوب کی نقل کی کوشش تو کی جائے؛لیکن اس کے مقاصد شریفانہ ہوں،اور جس سے تاریخ کا کوئی روشن پہلو سامنے آئے۔''إذا ھبت ریح الإیمان'' اسی خیال کا عملی وجود ہے۔اس لیے آپ حضرات ان دونوں کتابوں کو پڑھتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیں،اور تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش کریں''۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد آپ نے فرمایا:

''ادب مرسل کی یہ دونوں کتابیں صرف نمونے کے لیے داخل نصاب ہیں،ورنہ دور حاضر میں اب ایسی بہت سی کتابیں آ گئی ہیں جو رواں اور شستہ وشگفتہ اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں۔**ان میں سے چند یہ ہیں:**

۱۔الطریق إلی المدینۃ(ندویؒ)۲۔روائع إقبال(ندویؒ) ۳۔مذکرات سائح فی الشرق العربی(ندویؒ) ۴۔من نھر کابل إلی نھر یرموک(ندویؒ) ۵۔رجال من التاریخ (طنطاویؒ) ۶۔قصص من التاریخ(طنطاویؒ)۷۔مقالات فی کلمات(طنطاویؒ)۸۔من نفحات الحرم(طنطاویؒ) ۹۔ذکریات(طنطاویؒ)۱۰۔حیاتی(أحمد أمینؒ)۱۱۔فیض الخاطر(أحمد أمینؒ)۱۲۔الأیام(طہ حسینؒ)۱۳۔علی ھامش السیرۃ(طہ حسین)۱۴۔عبقریات(عقادؒ)۱۵۔وحی القلم (رافعیؒ)۱۶۔النظرات(منفلوطیؒ)۱۷۔العبرات (منفلوطیؒ)۱۸۔ماجدولین(منفلوطیؒ)

جب نقد ادب کے گھنٹے میں تشریف لائے،تو کتاب اور صاحب کتاب کی خصوصیات پر مفصل روشنی ڈالی۔اور بتایا کہ''ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا ایک ممتاز اسلامی ادیب وناقد تھے۔ان کی یہ کتاب''نحو مذھب

اِسلامی فی الأدب والنقد'' اسلامی ادب اور نقد ادب کی اہم ترین کتاب شمار کی جاتی ہے۔اس کتاب میں شعر وادب کے حوالے سے اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر مصنف نے ادب کے حوالے سے مغرب کے نقطہ ؟ نظر کو بیان کیا ہے،اور تاریخ کے مختلف ادوار میں مغرب میں ادب کے جو نظریات ورجحانات پائے جاتے رہے ہیں،ان کو پیش کر کے اسلامی نقطہ ؟ نظر سے ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اسلام کے موقف کو بڑی مضبوطی سے پیش کیا ہے،جس سے مغربی تصوراتِ ادب کی کمزوری اور اسلامی ادب کی مضبوطی؛ بلکہ برتری ظاہر ہوتی ہے۔ادب اسلامی اور مغرب کے تصورات ادب کے مابین تقابلی مطالعہ اس کتاب کی منفرد شناخت ہے۔کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فصیح عربی زبان اور معروضی اسلوب میں تجزیاتی،علمی اور تنقیدی مطالعہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔جس کا مواد قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے''۔

استادمحترم کے محاضرات کی چند جھلکیاں:

تخصص کے سال دوم میں استادمحترم کیمحاضرات کے گھنٹے تھے۔ آپ نے''علم النفس والاجتماع'' اور''استشراق ومستشرقین'' کے موضوع پر کئی پرمغز اور نہایت قیمتی محاضرات دیے۔ ان محاضرات کو میں نے دوران درس ہی قلم بند کرلیا تھا۔ان شاءاللہ کسی مناسب موقع سے وہ شائع کیے جائیں گے؛لیکن یہاں دو اقتباس پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

انسان کے مزاج وطبیعت اور اس کی ظاہری وباطنی خصوصیات کی تشکیل وتعمیر کب سے شروع ہوتی ہے اور اس کے عوامل وعناصر کیا ہیں؟اس حوالے سے یہ اقتباس دیکھیں:

''انسانی مزاج وطبیعت اوراس کی ظاہری وباطنی خصوصیات کی تشکیل وتعمیر کا آغاز رحم مادر سے ہونے لگتا ہے۔جو قطرہ رحم مادر میں پڑتا ہے،اس میں والدین اوران کے خاندان کی خصوصیات،عادات واطوار،مزاج،جسمانی رنگ،قدوقامت، چہرے،بال، آنکھ کے علاوہ جسمانی بناوٹ یہاں تک کہ غذا کی نوعیت،حرام وحلال کے فرق کے ساتھ،عقائد،باہمی تعلقات،گھریلو ماحول،جغرافیائی آب وہوا ... یہ وہ عوامل ہیں جو رحم مادر میں انسان کی تعمیر وتشکیل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

یہ بات تو واضح ہے کہ جیسے ظاہری طور پر جسم اور دل ودماغ خارجی اثرات قبول کرتے ہیں،اسی طرح انسان کا باطن بھی اندرونی اثرات اور معنوی محرکات کو قبول کرتا ہے۔قرآن وحدیث میں ان سب کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اورانسان کو پوری ہدایت دے دی گئی ہے کہ وہ اپنے ظاہر وباطن کو بنانے میں عقیدہ؟ توحید،عقید؟ رسالت اور عقیدہ آخرت کو ایسا سرچشمہ قرار دے جس سے اس کی سیرت وکردار کی تشکیل میں مدد ملے''۔

ایک بڑا قیمتی اور وقیع محاضرہ*''مراہقت کا دور اوراس کے تقاضے''* کے عنوان پر تھا۔جس میں اس دور کی نزاکتوں،تربیتی تقاضوں اور مختلف ممالک کی آب وہوا اور تہذیب وثقافت کے فرق سے پیدا ہونیوالے نتائج کو بڑیاچھےانداز میں آپ نے اجاگر کیا تھا۔

اہل علم بہ خوبی واقف ہیں کہ مغربی ممالک میں مذہب واخلاق کے باب میں آزادی کا تصور پایا جاتا ہے۔ وہاں کے باشندے مذہب کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہاں کے خاندانی نظام میں مرکزیت کا فقدان ہوتا ہے۔ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھیےاور ذیل کا اقتباس پڑھیے:

''مغرب نے آزادی کے نام پر چھوٹے بچوں کو بھی ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے؛اس لیے یہ بچے خودرو

گھاس کی طرح جنگل میں بڑھتے رہتے ہیں اور پورے معاشرے کے لیے ان کا وجود کسی نہ کسی طرح نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔یہی حال؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر حال ان بچوں کا ہوتا ہے جو عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اور غیر اخلاقی تعلقات کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ ایسے بچوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی تعلقات کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں، وہ ذہنی،فکری، جذباتی، عقلی، اخلاقی اور جسمانی لحاظ سے مریض پیدا ہو رہے ہیں۔مختلف اعصابی امراض کا شکار ہیں۔عقلی توازن سے محروم اور اعلی انسانی قدروں سے دور؛ بلکہ ان کے دشمن ہوتے ہیں۔اس کا ایک بھیانک نتیجہ یہ سامنے آرہا ہے کہ انسانی آبادی تیزی کے ساتھ گھٹ رہی ہے اور نئے نئے پیچیدہ مسائل ومشکلات پیدا ہو رہے ہیں،اور اس کے اثرات پوری دنیا پر پڑ رہے ہیں''۔

''استشراق اور مستشرقین''* کے عنوان سے جو محاضرات آپ نے دیے، وہ استشراق کی تعریف،اس کی تاریخ،اس کے پس منظر،اس کے دینی مقاصد اور چند مشہور مستشرقین کے تعارف پر مشتمل تھے۔ یہ محاضرے بھی بڑے قیمتی، جامع اور معلومات سے لبریز تھے۔

آپ کے درس کی چند خصوصیات:

استاد محترم کا درس انتہائی آسان ہوتا تھا۔آپ ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔ عام طور سے دوران درس سنجیدگی غالب رہتی؛ لیکن کبھی کبھی کچھ ایسے چست، سبک اور دل چسپ فقرے استعمال فرماتے کہ طلبہ میں،نشاط پیدا ہو جاتا۔آپ کے درس کی کئی اہم خصوصیتیں تھیں۔آپ کے ایک ممتاز شاگرد مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی نے اپنی کتاب ''میری محسن شخصیات'' میں آپ پر بھی ایک خوب صورت مضمون لکھا ہے۔ہم انھی کے الفاظ میں آپ کے درس کی خصوصیات کی ایک جھلک دکھاتے ہیں:

۱۔درس کے درمیان جچے تلے الفاظ اور جملوں کا استعمال، جن سے مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ بولتے وقت آواز کی ملائمت اور نرمی کا لحاظ جو درس کو مزید دل چسپ اور دل آویز بنادے: وہ بولتا ہے تو ایک روشنی سی ہوتی ہے

۲۔درس کے وقت طلبہ کی ذہنی وفکری صلاحیتوں اور استعداد کی رعایت۔

۳۔الفاظ وتعبیر اور جملوں کی وضاحت کے وقت آسان، سہل پسند اور افہام وتفہیم کا اسلوب۔

۴۔دروس کے وقت بعض عالمی مسائل کا ذکر؛ تاکہ طلبہ عالمی مسائل سے واقف ہوسکیں۔

۵۔درس کے دوران طلبہ کے نشاط اور چستی کو برقرار رکھنے کے لیے بعض لطائف کا تذکرہ۔(میری محسن شخصیات:۹۸)

۶۔،اپنی بات کی تائید میں قرآنی آیات سے استشہاد۔

فراغت کے بعد استاد محترم کی شفقت وعنایت کا سلسلہ اور باہمی تعلقات میں استحکام

یہ عجیب بات ہے کہ مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلما میں جب تک مصروف گل چینی رہا،استاد محترم سے تعلقات بہت زیادہ گہرے نہیں رہے۔ کلاس میں ملاقات ہوتی۔ النادی العربی کے ایک شعبے''اللجنۃ الثقافیۃ'' کے معتمد ہونے کی حیثیت سے کبھی کبھار آپ سے مشورے کی نوبت آتی۔ کبھی راہ چلتے ملاقات ہو جاتی،تو مختصر سی گفتگو ہو جاتی اور بس!

لیکن جب ندوۃ العلما سے فراغت کے بعد 28/ستمبر 2010ء کو احمد آباد(گجرات) کی قدیم ومعروف درس گاہ''جامعہ فیضان القرآن'' میں تدریس سے وابستہ ہوا،تو تدریسی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے گاہے گاہے اپنے بعض مخلص اساتذہ کو خطوط لکھتا،جن میں ان کی

خدمات کا اعتراف بھی کرتا، ان کی ذات سے اپنی محبت وشیفتگی کا اظہار بھی کرتا اور ان سے رہنمائی کا طالب بھی ہوتا۔ ایک خط میں نے اپنے انتہائی شفیق ومحبوب استاد مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی صاحب کو لکھا۔ اتفاق سے ملازم پر نذر ونذیر کی مماثلت واضح نہ ہوسکی اور اس نے وہ خط مولانا نذیر احمد صاحب کے بجائے مولانا نذر الحفیظ صاحب کے سپرد کر دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد استاد محترم مولانا عبدالقادر ندوی صاحب کے ساتھ آپ گجرات تشریف لائے۔ جب سفر مکمل کر کے لکھنؤ لوٹ رہے تھے، تو آپ نے کہیں سے نمبر حاصل کر کے فون کیا اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں اپنی سعادت سمجھ کر وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا۔ جیسے ہی استاد محترم سے ملاقات ہوئی، حبیبی حبیبی کہہ کر سینے سے لگا لیا۔ دیر تک دعائیں دیتے رہے اور سر پر دست شفقت پھیرتے رہے۔ میں آب دیدہ ہوگیا، اور سوچ میں گم ہوگیا کہ ایسے مشفق استاد بھی ہوتے ہیں، جو اپنے بے تعلق شاگردوں کے ساتھ بھی اس طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔

استاد محترم کی شفقت وعنایت اور ان کے لطف وکرم سے سیراب ہونے کا یہ پہلا موقع تھا، جس سے میرے دل میں آپ کی قدر ومنزلت پہلے سے دوچند ہوگئی۔ پھر آپ نے پہلے معذرت کی اور اس راز کو فاش کیا کہ تمھارا خط مولانا نذیر صاحب کی بجائے مجھے مل گیا، اور میں نے اسے پڑھ بھی لیا۔ جب بعد میں لفافے پر غور کیا تو مولانا نذیر صاحب کا نام دیکھ کر مجھے بڑی ندامت وخفت محسوس ہوئی۔ میں نے ان سے بھی معذرت کر لی ہے، سوچا تم سے بھی معذرت کر لوں۔ پھر فرمایا: خط کا مضمون بھی اچھا تھا اور طرز واسلوب بھی خوب تھا۔ خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ماشاءاللہ تم عربی کا ستھرا ذوق رکھتے ہو۔ یہ استاد محترم کا اپنے خردوں اور شاگردوں کی ہمت افزائی کا عام طریقہ تھا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم!

میرا تخصص کا مقالہ اور استاد محترم کا ایک مخلصانہ مشورہ:*

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشاؒ میرے محبوب ترین اور پسندیدہ ادبا میں تھے۔ عربی کے ابتدائی کلاس ہی میں ''صور من حیاۃ الصحابۃ'' کے ذریعے ان سے تعارف ہوا۔ آگے چل کر یہ تعارف عشق ومحبت میں بدل گیا۔ ان کی اس کتاب نے میرے لوح قلب پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ جب تخصص کا سال دوم آیا اور استاد محترم نے مقالے کا عنوان منتخب کرنے کا حکم دیا، تو میں نے بلا تردد یہ فیصلہ کر لیا کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشاؒ کی حیات وخدمات کو اپنے مقالے کا موضوع بناؤں گا۔ چنانچہ جب میں نے ان کی شخصیت پر مقالہ لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، تو مجھے ''سعادۃ الدکتور عبدالرحمٰن رأفت الباشا فی ضوء کتاباتہ'' کے عنوان پر مقالہ تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ عنوان میری پسند اور دل چسپی کا تھا، اس جب مقالے کا خاکہ تیار کر کے اپنے مشرف، استاد محترم مولانا محمد علاء الدین ندوی صاحب کی خدمت میں اسے پیش کیا، تو آپ نے اس میں جزوی ترمیم کر کے کچھ رہنمائی فرمائی اور کام شروع کرنے کا حکم دیا۔ اب جب میں نے مواد جمع کرنے کے لیے ندوے کے کتب خانوں کی خاک چھاننی شروع کی، تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشاؒ جیسی شخصیت پر مواد نہ کے برابر تھا۔ "البعث الاسلامی" کے ایک شمارے (اکتوبر 1986) میں ان کی حیات وخدمات پر چند متفرق تأثراتی نوعیت کے مضامین ملے۔ اسی طرح "إتمام الأعلام" میں ان کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں ملیں۔ استاد محترم مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ڈاکٹر محمد خیر رمضان یوسف کی کتاب "تکملۃ معجم المؤلفین" سے

کچھ رہنمائی ملی۔ اس طرح کی چند کتابیں اور تھیں جن میں مختصر سا ان کا تعارف وتذکرہ ملا؛ لیکن ظاہر سی بات ہے کہ تخصص کے مقالے کے لیے مجھے بھرپور مواد کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے کتابوں کے ساتھ اساتذہ سے بھی ربط کرتا رہا۔ اس سلسلے میں حضرت الاستاد مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ سے بھی رہنمائی چاہی؛ مولانا واضح صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ مولانا اقبال ندوی صاحب کیپاس جایئے اور ان سے کہیے کہ مجھے مجلّہ " الأدب الإسلامی" کے سارے شمارے دیکھنے ہیں۔ وہاں آپ کو اچھا خاصا مواد مل جائے گا۔ جب مولانا اقبال صاحب سے ملاقات کی تو آپ نے بہ خوشی سارے شمارے دیکھنے اور گھنگالنے کی اجازت دے دی۔ لیکن مجھے کامیابی نہ مل سکی؛ کیوں کہ اس وقت (2010 کے اواخر) تک رأفت پاشا صاحب پر "الأدب الإسلامی" کا خاص نمبر شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ حضرت ناظم صاحب (مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی) نے یہ رائے دی کہ اس سلسلے میں مولانا سعید مرتضی ندوی صاحب سے رابطہ کرو؛ کیوں کہ وہ ریاض میں ایک عرصہ گزار کر آئے ہیں۔ جب میں مولانا سے ملا، تو انھوں نے کچھ معلومات فراہم کردیں۔ غرض یہ کہ جس قدر معلومات یہاں وہاں سے مجھے ملتی جاتیں، ان کو محفوظ کرتا جاتا؛ مگر افسوس کہ سال کے اخیر تک ایک دو فصل کا مواد ہی جمع ہوسکا، اور وہ بھی ناقص شکل میں۔ ادھر میرا طالب علمی کا رسمی تعلق بھی ندوۃ العلما سے منقطع ہوگیا، اور میں احمد آباد تدریس کے لیے پہنچ گیا۔

اپریل 2012ء میں مولانا سید سعید مرتضی ندوی صاحب سفر عمرہ پر تشریف لے گئے۔ وہاں سے آپ مجلّہ ''الأدب الإسلامی'' کا وہ خاص نمبر لے کر آئے جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا صاحبؒ کی حیات وخدمات پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کی تلخیص وانتخاب پر مشتمل تھا۔ اور میری خوش نصیبی کہ مجلّے کا یہ خاص نمبر اپریل 2012 ہی میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجلّہ مواد سے بھرپور تھا، جس سے مجھے اپنے مقالے کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ بڑی مدد ملی؛ بلکہ اس نے کئی اور اہم مراجع کی نشان دہی کی۔

مئی 2015ء میں میرا مقالہ جب تیار ہوگیا، تو میں نے گجرات ہی سے اپنے مشرف، استاد محترم مولانا محمد علاؤالدین ندوی صاحب کی خدمت میں مقالہ ارسال کردیا؛ تاکہ مقالے پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈال کر آپ کلمۃ المشرف لکھ دیں۔ استاد محترم نے بہت جلد مقالہ چیک کرکے ایک مختصر؛ مگر جامع تحریر لکھ دی۔

کچھ دنوں بعد اساتذہ سے ملاقات کی غرض سے مادر علمی ندوۃ العلما حاضر ہوا۔ کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے دفترِ عمید میں استاد محترم مولانا نذر الحفیظ ندوی صاحب اور مولانا محمد علاء الدین ندوی صاحب سے ایک ہی ساتھ ملاقات ہوگئی۔ مولانا نذر الحفیظ صاحب نے مولانا محمد علاء الدین صاحب سے میرا تعارف کرایا (جو مجھے شاید شکل سے نہیں پہچانتے تھے) پھر مقالے کے بارے میں تعریفی کلمات کہے۔ اور اشاعت کی کوئی شکل نکالنے کی طرف توجہ دلائی۔

میں احمد آباد آگیا اور اپنی تدریسی ذمے داریوں میں مشغول ہوگیا۔ اسی دوران معلوم ہوا کہ جامعۃ العلوم (گڑھا، سابر کانٹھا، گجرات) میں رابطہ؟ ادب اسلامی کا پروگرام ہے، جس میں استاد محترم مولانا نذر الحفیظ ندوی صاحب بھی شرکت فرمائیں گے۔ جامعۃ العلوم جانے کے لیے پہلا پڑاؤ احمد آباد ہی تھا۔ میرا مدرسہ ریلوے اسٹیشن سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اسٹیشن پہنچا، ملاقات ہوئی۔

ہمارے مدرسے تشریف لائے،اور تقریباً دو تین گھنٹے قیام رہا۔مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں۔پھر آپ نے مقالے کا ذکر چھیڑ دیا۔آپ نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر یہ مقالہ عالم عرب سے چھپ جائے،تو زیادہ بہتر ہوگا۔ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا صاحبؒ کے صاحب زادے ابھی باحیات ہیں۔ان سے رابطہ کرکے اپنا مقالہ ان کے پاس بھیج دو۔یا رابطہ؟ ادب اسلامی (ریاض) کی میل آئی ڈی پر مقالہ ارسال کردو۔میں نے کہا: ان شاءاللہ کوشش کروں گا؛لیکن اس کی نوبت ابھی تک نہ آسکی۔

میری کتاب ''ممارا قنی'' کی اشاعت اور پسندیدگی کا اظہار:

جولائی 2016ء میں مولانا محمد غزالی ندویؒ کی خواہش پر میں احمد آباد سے علی گڑھ منتقل ہوگیا،اور امام بخاری ریسرچ اکیڈمی کے شعبۂ تحقیق وتصنیف سے جڑ گیا۔ اس دوران میری ایک دو چھوٹی کتابیں شائع ہوئیں؛لیکن استاد محترم تک وہ نہ پہنچ سکیں۔

اپریل 2019ء میں میری کتاب ''ممارا قنی'' منظر عام پر آئی، جو دراصل تقریباً ایک ہزار عربی واردو تعبیرات ومحاورات اور امثال وحکم پر مشتمل میرے ایام طالب علمی کا اندوختہ ہے۔اس کتاب کی اشاعت ایسے وقت میں ہوئی جب "المعہد الاسلامی العربی" کے زیر اہتمام جامعہ تحفیظ القرآن (اسلام پورا،سابرکانٹھا،گجرات) میں " یک ماہی عربی بول چال کورس " شروع ہونے والا تھا۔ برادرم مولانا حماد کریمی ندوی کا اصرار تھا کہ آپ اس کے افتتاحی پروگرام میں اس سال شرکت کی کوئی شکل ضرور نکالیں اور ساتھ میں کتاب کے 200 نسخے بھی لیتے آئیں۔ میں نے سوچا کہ کئی بار وعدہ خلافیاں ہوچکی ہیں،اس لیے اس بار ضرور شرکت کرنی چاہیے۔ میں نے رفیق مکرم مولانا محمد فرید حبیب ندوی کو تیار کیا،اور ان کے ساتھ گجرات کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ چوں کہ استاد محترم معہد کے سرپرستوں میں تھے، اس لیے وہ اس کیا فتتاحی پروگراموں میں شرکت ضرور فرماتے تھے۔وہاں جب استاد محترم سے ملاقات ہوئی،تو ان کی خدمت میں اپنی یہ تازہ کتاب پیش کی۔بڑے خوش ہوئے، دعائیں دیں۔پروگرام میں ''أهمية اللغة العربية في مجال الدعوة'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرنے کی سعادت ملی، جسے استاد محترم نے بڑا سراہا۔اسی پروگرام میں المعہد الاسلامی العربی کی جانب سے مجھے استاد محترم کے ہاتھوں ایک ایوارڈ (جائزة العلامة الدكتور سعيد الرحمٰن الأعظمي الندوي العلمية) سے نوازا گیا۔

وقت کی کمی کی وجہ سے ہم لوگ اسی روز شام کو علی گڑھ واپس ہوگئے۔استاد محترم جب لکھنؤ پہنچے،تو فون کرکے مبارک باد دی اور فرمایا: حبیبی! راستے میں تمھاری کتاب رفیق سفر رہی۔تم نے خوب پھول چنے ہیں۔ابھی تو چوں کہ رمضان قریب ہے۔عید بعد ان شاءاللہ ندوے میں اس کی رسم اجرا کی کوئی شکل نکالیں گے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی؛لیکن عید بعد ہم لوگوں کو امام بخاری ریسرچ اکیڈمی کے بانی مولانا محمد غزالی ندویؒ کی غیر متوقع وفات کا سخت صدمہ جھیلنا پڑا،جس کی وجہ سے یہ پروگرام وقت مقررہ سے ٹل گیا،اور بقرعید کے قریب یہ پروگرام ہوسکا۔جس روز ہم لوگ ندوے پہنچے،اسی روز ندوۃ العلما میں عصر بعد کوئی اور پروگرام تھا،جس کی وجہ سے ندوے میں تو پروگرام نہ ہوسکا؛لیکن ندوے کے قریب اس کی شاخ "جامعہ خدیجۃ الکبری للبنات" میں رفیق مکرم مولانا محمد مسعود عالم ندوی کی نظامت اور استاد محترم کی صدارت میں بعد نماز عصر ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی،جس میں رفیق مکرم مولانا محمد فرید حبیب ندوی کی کتاب ''قطری الندی کوئز'' (دوسرا ایڈیشن)

اور میری اس کتاب کی رسم اجرا ہوئی، اور اساتذہ سے خوب دعائیں ملیں۔

اس پورے پس منظر پر جب نظر ڈالتا ہوں، تو استاد محترم کے بارے میں یہی رائے بنتی ہے کہ وہ بڑے قدر شناس تھے۔ وہ اپنے خردوں کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے تھے؛ بلکہ اکسا کر ان کو اور بھی مستعدی سے کام کرنے کی ہمت دلاتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے ان کو مفید مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔

امام بخاری ریسرچ اکیڈمی کی مطبوعات کے بارے میں قدردانہ اظہار تأثر:

ادھر میں جب سے علی گڑھ منتقل ہوا، لکھنؤ بار بار جانے کا موقع ملا۔ کبھی ذاتی کام سے، تو کبھی اکیڈمی کے کاموں سے۔ جب بھی لکھنؤ کا سفر ہوتا، استاد محترم سے ملاقات ہوتی۔ اکیڈمی کی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کرتے۔ وہ اکیڈمی کے بانی مولانا محمد غزالی ندویؒ سے بڑی محبت فرمایا کرتے تھے اور ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے حددرجہ معترف تھے۔ جب مولانا غزالی مرحوم کی حیات وخدمات پر اکیڈمی کی جانب سے ''ذکر غزالی'' نام سے کتاب شائع کی گئی، تو آپ کی خدمت میں بھی اس کا ایک نسخہ بھیجا، جسے آپ نے پسند فرمایا۔ پھر جب چند مہینے قبل مولانا مرحوم کی تحقیقی کتاب ''اہل کتاب اور مسئلہ ؟ کفر وایمان (ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ)'' منظر عام پر آئی، تو میں اور مولانا محمد فرید حبیب ندوی اس کا ایک نسخہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بڑے خوش ہوئے۔ کتاب کے مشمولات پر ادھر ادھر سے نظر ڈالی۔ تعریفی کلمات کہے اور فرمایا: تمھاری اکیڈمی سے اچھی کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ یہ تو بڑی وقیع تحقیقی اور علمی کتاب ہے۔ ان شاء اللہ اسے ضرور پڑھوں گا۔

استاد محترم سے یہی میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد ان سے ملاقات نہ ہوسکی، اور آپ ہمیشہ کے لیے چشم عالم سے نہاں ہوگئے۔ آپ تو چلے گئے؛ لیکن اپنے پیچھے اپنی یادوں کی ایک انجمن چھوڑ گئے:

آتی ہی رہے گی ترے انفاس کی خوشبو
گلشن تری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

استاد محترم کے چند امتیازات وخصوصیات:

استاد محترم ایک شفیق ومہربان استاد، باکمال صحافی، ماہر تجزیہ نگار، کامیاب ایڈیٹر، اچھے نقاد اور اردو وعربی کے ممتاز انشا پرداز تھے۔ آپ نے اظہار مافی الضمیر کے لیے گرچہ اردو کے میدان ہی کو چنا، عربی میں بہت زیادہ آپ نے نہیں لکھا؛ لیکن جو لکھا اور جتنا لکھا، وہ ٹھوس معلومات اور گہرے مطالعے کے بعد لکھا۔ اردو میں آپ کی تحریریں جس قدر پڑھیں، اس سے اندازہ ہوا کہ مطالعے کی وسعت، طرز و اسلوب کی معروضیت، لہجے کا اعتدال اور زبان وبیان کی سلاست وروانی آپ کی تحریر کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

آپ دارالعلوم ندوۃ العلما میں عالم اسلام اور عالم عربی کے احوال سے سب زیادہ واقفیت رکھنے والے دو تین نمایاں اساتذہ میں تھے۔ اور حضرت الاستاد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے بعد تو اس حوالے سے آپ ہی مرجع تھے۔ الغزو الفکری کا موضوع بھی آپ کی دل چسپی کا تھا۔ مغربی؛ بلکہ عالمی میڈیا پر بھی آپ کی بڑی گہری نظر تھی۔ آپ کی کتاب ''مغربی میڈیا اور اس کے اثرات'' اپنے موضوع پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ نے اس کتاب کو بڑی قبولیت بخشی، اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

استاد محترم ندوۃ العلما میں حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں حسنی ندویؒ کے افکار کے ترجمان وشارح سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی بوالحسن شناسی مسلم تھی۔تقریباً آپ کی ہر گفتگو کی تان حضرت مولاناؒ پر ہی جا کر ٹوٹتی تھی۔

اللہ نے آپ کو بڑا قوی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ حضرت مولانا علی میاںؒ کی سینکڑوں عبارتیں اور علامہ اقبالؒ کے سینکڑوں اشعار آپ کو ازبر تھے۔جنھیں آپ اپنی تحریر وتقریر میں برمحل استعمال کر کے اس میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔

آپ کی ایک نمایاں خصوصیت قلب ونظر کی وسعت تھی۔آپ مختلف حلقوں کے مثبت کاموں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے؛ بلکہ ان کی اختلافی باتوں میں بھی نقطہ اشتراک واتحاد تلاش کرلیا کرتے تھے۔

استاد محترم کا ایک نمایاں وصف یہ تھا کہ آپ کو معیاری اور تعمیری کتابوں کے انتخاب میں عجیب ملکہ حاصل تھا۔ آپ اپنے شاگردوں کو ہرطرح کی کتابیں پڑھنے سے روکتے تھے؛ بلکہ آپ اپنے شاگردوں کو تعمیری کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے وقت بھی ہمیشہ یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ تم وہی کتابیں پڑھو جو تمھارے مقصد کے لیے مفید ہوں؛ اس لیے کہ مقصد اگر پیش نظر نہ ہو، تو مطالعے میں گزرا ہوا وقت بھی بسا اوقات ضیاع وقت کا سبب بن جاتا ہے۔اس لیے اگر کسی کتاب سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو، تو اس کے مطالعہ کرنے سے پہلے تم اپنا مقصد مطالعہ متعین کرلو۔ واقعی یہ بڑے پتے کی بات ہے۔

استاد محترم نے مطالعے کو مفید بنانے کے لیے اپنے تجربات کی روشنی میں چھ انتہائی اہم اور ضروری پوائنٹس بیان کیے ہیں، جو ہر مطالعہ کرنے والے کے پیش نظر ہونے چاہئیں۔وہ یہ ہیں:

۱۔ادبی کتابوں کو غور سے پڑھیں اور ان کی عبارتوں کو زبان سے ادا کریں۔

۲۔علمی اور تاریخی کتابوں کو سمجھنے کے بعد مفید معلومات کو ذہن میں ترتیب کے ساتھ محفوظ کریں۔

۳۔اچھے جملے، محاورے اور حکمت کی باتیں دو تین بار پڑھیں، ہو سکے تو نوٹ کرلیں۔

۴۔کتاب کے آخر میں مطالعے کا خلاصہ اپنے ذہن میں تازہ کرلیں، یا اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیں۔

۵۔اگر تفصیلی مطالعے کا موقع نہ ملے، تو کم از کم کتاب کی فہرست اور مقدمہ ضرور پڑھ لیں۔

۶۔کتاب پڑھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور قائم کریں۔

(مطالعہ: کیوں اور کیسے؟ مفتی رحمت اللہ ندوی، صفحہ:134)

آپ کے اوصاف سیرت میں: تعلق مع اللہ، تعلق مع القرآن، حب اہل بیت، عشق صحابہ، سادگی، نام ونمود سے گریز، ملنساری، شگفتہ مزاجی، دل نوازی، محبت وتعلق کا نبھاؤ، شاگردوں کی حوصلہ افزائی اور خردوں پر شفقت ومحبت، قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

❑ وفیات

آہ! رئیس الشاکری: اب نہ پائے گا زمانہ کبھی ان کی تمثیل

محمد اویس سنبھلی

گذشتہ ایک ماہ علم و ادب کی دنیا پر قہر بن کر ٹوٹا ہے، اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ روز کسی اپنے کی جدائی کا صدمہ غم میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی، تبسم فاطمہ، شاہد علی خاں، وجاہت فاروقی، انجم عثمانی، مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر مولا بخش، رخسانہ نکہت لاری، احسن اعظمی، رضا حیدر، فرقان سنبھلی، مہتاب حیدر صفی پوری، شوکت حیات، پروفیسر منظر عباس نقوی جیسی ادبی شخصیات گذشتہ چند دنوں میں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ مولانا ولی رحمانی، مولانا نور عالم خلیل امینی اور مولانا عبدالمومن ندوی جیسے دین اسلام کے پائیدار ستون گر گئے۔ ان میں سے چند شخصیات کا شمار تو ان عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جن کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے، اور جن کے رخصت ہوجانے سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے اس کے پُر ہونے کی حال فی الحال میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ان شخصیات کی وفات ہم سب کا مشترکہ صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان پر نازل ہوں۔ آمین۔

۳ رمئی ۲۰۲۱ کی صبح عربی زبان وادب کا انتہائی معتبر نام مولانا نور علم خلیل امینی کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ مولانا صاحب دنیائے علم و ادب کے درخشاں قطبی ستارے تھے۔ ابھی ہم مولانا کے یوں اچانک چلے جانے پر غم زدہ تھے کہ شام ہوتے ہوتے مشفق و مہربان محترم رئیس الشاکری کے سانحہ ارتحال نے مجھے اتنا اداس کر دیا کہ مجھے تو جیسے چپ ہی لگ گئی۔ میں نے یہ رات دکھ کے ساتھ گزاری اور مرحوم کو بہت یاد کیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔ آمین۔

سن ۲۰۰۸ء کی بات ہے، میں نے جب اردو کے میدان میں قدم رکھا تو تین لوگ ایسے تھے جن سے بہت جلدی تعارف ہوگیا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی کتاب 'شہر سخن' کاکوری آفسیٹ پریس میں چھپی تھی؛ لیکن اس کی بائنڈنگ میرے یہاں ہوئی۔ ملک زادہ صاحب نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری ڈاکٹر مخمور کاکوروی کو دی تھی۔ یہی کتاب ڈاکٹر مخمور کاکوروی سے تعلقات کا سبب بنی جو الحمدللہ آج بھی بدستور قائم ہیں۔ دوسری ملاقات برادر محترم رضوان فاروقی سے ہوئی۔ رضوان فاروقی صاحب کا مضمون 'لکھنؤ کچھ ماضی کچھ حال' روزنامہ آگ میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ یہ مضمون مجھے بہت اچھا لگا لہٰذا میں نے رضوان بھائی سے اسے مستقل لکھنے اور کتابی شکل میں محفوظ کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے

محنت سے یہ مضمون مکمل کیا۔ بعد میں یہ کتابی شکل میں شائع بھی ہوا۔ ڈاکٹر مخمور کاکوروی اور جناب رضوان فاروقی کے بعد جس شخصیت سے تعارف ہوا، وہ شخصیت محترم رئیس الشاکری کی تھی۔ ۲۰۰۸ء میں کاکوری پریس سے ان کی رباعیات کا مجموعہ القاء شائع ہوا۔ اس زمانے میں میرے مراسلے پابندی سے روزنامہ آگ اور راشٹریہ سہارا میں شائع ہونے لگے تھے۔ وہ میرے نام سے واقف تھے؛ لیکن پہلا باقاعدہ تعارف کام کے سلسلہ میں ہوا۔ 'القاء' کی بائنڈنگ کے سلسلہ میں وہ پریس آئے۔ میں انھیں پہلے سے اس لیے جانتا تھا کہ وہ 'رحمان فاؤنڈیشن' کے دفتر میں کام کر چکے تھے۔ میں نے بارہا انھیں وہاں دیکھا تھا؛ لیکن ان سے تعارف نہیں تھا۔ وہ پریس آئے اور انھوں نے اپنی کتاب کی بائنڈنگ کے سلسلہ میں بات کی۔ میں نے خود ان سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ بہت دعائیں دیں۔ اس کے بعد تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ رئیس الشاکری صاحب نے اپنی کتاب 'القاء' کا ایک نسخہ مجھے یہ لکھ کر دیا کہ 'اپنے اویس کے لیے، جن کو میں بہت چاہتا ہوں اور بس!'۔

محترم حسیب صدیقی ایڈوکیٹ نے رئیس الشاکری کے مجموعہ رباعیات 'القاء' کا اجرا میزبان ہوٹل میں بڑے اہتمام سے کرایا تھا۔ جلسہ میں بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر شارب ردولوی صاحب نے شرکت فرمائی اور صدارت کے فرائض مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے انجام دیے۔

رئیس الشاکری کو اس کتاب کے توسط سے میں نے پہلی بار پڑھا تھا جبکہ اس سے قبل ان کے تین نعتیہ مجموعے (خیر الامم کی بارگاہ میں، حرا، کوثر) اور ایک نعتیہ تضمین (محمد جب یاد آئے) شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے تھے نیز ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ 'پایاب' کے نام سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی میری نظر سے اس وقت تک نہیں گزرا تھا۔ ایک روز میں اپنے والد کی لائبریری میں کسی کتاب کی تلاش میں تھا کہ رئیس الشاکری کی غزلیات کا مجموعہ 'پایاب' مجھے مل گیا۔ ۳۱ رمئی ۲۰۰۳ء کو انھوں نے یہ مجموعہ راقم الحروف کے والد ماجد کی خدمت میں اپنے دستخط کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس مجموعے میں پروفیسر شارب ردولوی اور عرفان صدیقی نے رئیس الشاکری کی غزل گوئی کے بارے میں لکھا تھا۔ ان کی آرا کسی طرح بھی سند سے کم نہیں۔ پہلی رائے پروفیسر شارب ردولوی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''رئیس الشاکری ایک اچھے غزل گو اور ایک مخلص شاعر ہیں، وہ آج کے حالات کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اسے اسی طرح نظم کر دیا کرتے ہیں۔ صاف گوئی، سادگی، سلاست ان کے شعری مزاج کا حصہ ہے''۔

رئیس الشاکری کی غزلوں میں بیان کی سادگی اور اظہار کا سلیقہ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ عرفان صدیقی مرحوم نے رئیس الشاکری کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی یہ رائے قلم بند کی:

رئیس الشاکری کی غزل کا پیرایۂ اظہار سادہ اور راست ہوتے ہوئے بھی شعری حسن اور تاثیر کا حال ہے۔ ان کے لسانی اور تہذیبی پس منظر نے انھیں لفظوں کے انتخاب و استعمال کا سلیقہ اور کلاسیکی روایات سے آگاہی ودیعت کی ہے اور یہ دونوں ہی خصوصیات آج کے دور میں کمیاب ہوتی جا رہی ہیں''۔

رئیس الشاکری کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لذت غم ہے کہ لفظوں میں سماتی ہی نہیں
بے سخن جھوم اٹھے عشق کے آزار سے ہم

دل کو چھو رہی ہے بے گناہی

لہو چپ ہے تو خنجر بولتا ہے
سب ہراساں دکھائی دیتے ہیں
جیسے بستی میں کوئی خطری ہے
کتنا واقف تھا زندگی سے رئیسؔ
غم کی بنیاد ڈالنے والا
ہجر میں کم بھی نہیں پچھلے پہر کی آہیں
موسم گل نہ سہی رقص شرر تو مانگو
کچھ نہ کچھ کہہ گئیں آنکھیں دل مرحوم کا حال
مجھ سے بھی راز محبت کا چھپایا نہ گیا
باغ کے سرخ گلابوں کی جوانی ہے گواہ
اس کا چہرہ کبھی لفظوں میں سجایا نہ گیا
اجڑ جائے نہ پھر غالب کی دلّی
ہزاروں شعر نادر ہوگئے ہیں

رئیس الشاکریؔ موضع 'برہواں' علی آباد کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ بعد میں انھوں نے یوپی کے ایک قدیم اور روایت پرست قصبہ ردولی کو اپنا وطن بنایا اور ۴ رمئی ۲۰۲۱ کو اسی قصبہ کے قبرستان شیخ صفی الدین میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ رئیس الشاکری کے گھرانے میں شعر و ادب کا چرچا ہمیشہ رہا ہے۔ ان کے والد بزرگوار مرحوم مولوی منظورؔ احمد صاحب استاد شاعر تھے اور چچا مرحوم فیاضؔ احمد فیاضؔ کو بھی شعر و ادب سے خاصی دلچسپی رہی۔ والد مرحوم مثنوی گوئی اور چچا غزل گوئی میں درک رکھتے تھے۔ والدہ مرحومہ فارسی اور اردو کا پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں۔ خود رئیس الشاکری اکثر کہا کرتے ہیں کہ **''مولانا روم کا نام اور کلام میری زندگی میں والدہ مرحومہ کا مرہون ہے، وہ زبان کی صحت پر ٹوکا کرتی تھیں جس کا فائدہ میں آج تک محسوس کر رہا ہوں۔''** گویا اس سے یہ تو صاف ہو جاتا ہے کہ رئیس الشاکریؔ کی تربیت کا اولین نقش اپنے والدین کے ہاتھوں بنا اور شاعری، تصوف، علمی لگن شروع سے مزاج کا حصہ بن گئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ خانقاہ ابوحمد یہ گل چپہ کلاں قصبہ علی آباد میں ہوئی۔ یہاں سے فراغت کے بعد وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور عالیت کی سند حاصل کی۔ ندوہ کے فراغت کے بعد انھوں نے تقریباً ۳۰ ربرس تک ردولی تحصیل کے حلیم نگر کی عیدگاہ میں امامت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ 'رحمان فاؤنڈیشن' سے بھی وابستہ رہے۔ سن ۲۰۰۸ء میں ان کا تقرر ندوۃ العلماء میں ہوا۔ ۱۳ ربرس تک انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں لائبریرین کے عہد پر فائز رہتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیں۔

رئیس الشاکری زمانہ طالب علمی سے شعر کہتے تھے۔ مولانا شاکر ناطقی کانپوری سے انھیں شرف تلمذ حاصل رہا اور اسی نسبت سے رئیس احمد، رئیس الشاکری ہوگئے۔ مولانا ماہر القادری سے انھوں نے بذریعہ ڈاک اپنے کلام پر اصلاح لی۔ ان دونوں بزرگوں کا فیض ہی کہا جائے کہ ان کا ادبی ذوق نکھرتا چلا گیا۔ رئیس الشاکریؔ کی شاعری کے اب تک ۶ رمجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور شعر و ادب کے منظر نامہ میں برائے نام ہی سہی شناخت ان کے حصہ میں ضرور آئی ہے۔ انہوں نے تمام صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، غزل ان کی محبوب صنف رہی ہے؛ لیکن دوسری کسی صنف میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ نعتیہ شاعری میں انھیں بہت مقبولیت حاصل تھی اور نعتیہ مشاعروں میں انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا نیز ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔

رئیس الشاکری اردو غزل کے علاوہ خوبصورت نعت بھی کہتے تھے، حبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا دامن سرشار تھا۔ وہ سچے اور پکے عاشقِ رسولؐ تھے۔ انھوں نے کیا

خوب نعتیہ شعر کہے ہیں۔

اگر کوثر کی خواہش ہے تو ساقی سے جڑے رہنا
کہ ساری قدر کھو دیتے ہیں ساغر بے سبو ہوکر

☆☆☆

ممکن ہے تم کو رحمت یزداں نواز دے
تم نے رئیس نعت کو شیوہ بنا لیا

☆☆☆

عجب نہیں وہ سر حشر سرفراز کرے
ہمارے ناز شہ اُنس و جاں اُٹھاتے ہیں

☆☆☆

رئیس ہی سہی لیکن فقیر طیبہ ہوں
وہ جانتے نہیں جو انگلیاں اُٹھاتے ہیں

اردو غزل کے گیسو سنوارنے اور نعتیہ شاعری میں اپنا ایک خاص مقام بنا لینے کے بعد رئیس الشاکری صاحب نے رباعی کی صنف میں خصوصی محنت کی اور ان کی محنت کا اندازہ ''القاء'' کے مطالعہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔فنی لحاظ سے رباعی بہت ہی مشکل فن ہے اس فن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فنی بصیرت ونظر کی وسعت کے ساتھ ساتھ کافی مشقِ سخن اور پختگی عمر کی ضرورت ہوتی ہے۔اس صنف میں کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب شاعر معمر ہوجاتا ہے۔جوش نے کہا تھا:

''رباعی ایسی کمبخت صنف ہے جو سارا جوبن کھالے تو ایک بالک پالے کی طرح چالیس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جاکر قابو میں آتی ہے''۔

صنف رباعی کے سلسلہ میں جوش کا یہ قول ''سارا جوبن کھالے تو ایک بالک پالے'' شاکری کو بھی قبول ہے۔

ہر لفظ ہو فنکار رباعی کے لیے
جب ذہن ہو تیار رباعی کے لیے
یارانِ سخن اچھی طرح جانتے ہیں
اک عمر ہے درکار رباعی کے لیے

''القاء'' رئیس الشاکری کا چھٹا مجموعہ کلام ہے۔اس میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی تقریظ بھی شامل ہے، جو رئیس الشاکری کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔فاروقی صاحب نے لکھا ہے:

''رئیس الشاکری کا انداز نظر اخلاقی اور حکیمانہ ہے لیکن وہ شعر کے تقاضوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، جگہ جگہ تلمیحات اور قرآنی فقروں کی گونج ان کے کلام کو مزید قوت اور گیرائی بخشتی ہے''۔

رئیس شاکری نے شعر کی وادی میں اپنا راستہ خاصی لگن اور ریاضت کے ساتھ طے کیا ہے۔ان کی زندگی اب تک جن پر پیچ راہوں سے گزری ہے ان سب کی جھلک ان کی شاعری کے آئینے میں دیکھی جاسکتی ہے۔انہوں نے جگہ جگہ انسانوں اور انسانی زندگی کے مسائل کو ابھارا ہے اور اسے انتہائی سادہ اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

مشکل ہو تو جینے کا مزا ملتا ہے
ہر سانس میں پیغام بقا ملتا ہے
دشوار سہی کوئے ملامت لیکن
اک سلسلۂ اہل وفا ملتا ہے

☆☆☆

بچوں سے جو مجبور ہوئے ہیں ماں باپ
دیوار کے نقش بن گئے ہیں ماں باپ
بھائی سے لڑے بھائی تو جائیں بھی کدھر
خاموش کھڑے دیکھ رہے ہیں ماں باپ

رئیس الشاکری نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی

شاعری کا موضوع بنایا لیکن رومانی عناصر اور عشقیہ موضوعات پر انہوں نے زیادہ شاعری کی مگر ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ موضوعات روایتی ہیں پھر بھی ان میں ایک نیا پن ہے۔ ان کے عشقیہ مضامین میں جذبہ کی سچائی اور خلوص نظر آتا ہے۔ وہ عشق اور محبت کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی شاعری دبستان لکھنؤ کی نمائندہ ہے، ملاحظہ ہو۔ ؎

آنکھوں کی نگارش کا اثر کیا ہوتا
اشکوں کی سفارش کا اثر کیا ہوتا
پتھر کو سماعت کا سلیقہ ہی نہیں
پھر میری گزارش کا اثر کیا ہوتا

☆☆☆

جب ذہن کو یادوں نے جگایا ہوگا
پہروں مجھے اُن آنکھوں نے سوچا ہوگا
آنگن آنگن اداسیوں کا باعث
گھر کے در و دیوار نے پوچھا ہوگا

رئیس الشاکری کی شاعری نہ صرف ہماری نئی نسل کو بلکہ عہد حاضر کے اربابِ نظر کو بھی خوب خوب متاثر کرے گی اور مجھے امید ہے کہ مستقل میں ان کی شاعری پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

یوں تو رئیش الشاکری کی شخصیت اور ان کی شاعری پر کہنے اور لکھنے کو بہت کچھ ہے؛ لیکن آج ان سے متعلق بہت سی یادیں اور ان کی باتیں رہ رہ کر ذہن کے پردے پر گردش کر رہی ہیں۔ میں اکثر ان سے ملاقات کے لیے ندوۃ العلماء کی علامہ شبلی نعمانی لائبریری جایا کرتا تھا۔ کافی دیر ان کے پاس بیٹھتا... کبھی کبھی ندوہ میں ان کے کمرے پر بھی جانا ہوا۔ وہ بڑی دلچسپ گفتگو کرتے ..اشعار سناتے.... بزرگوں کے واقعات اور ان کی مجالس کا تذکرہ کرتے۔ لیکن افسوس! وہ آخری زمانے میں اپنے گھر سے 'ہار' چکے تھے۔ گھر جانے کے بجائے ندوہ کے کمرے میں پڑے رہنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ اس کا اثر ان کی صحت پر پڑنے لگا تھا۔ ذہنی طور پر بھی کافی کمزور ہوگئے تھے۔ آخری ملاقات کا حال تو یہ ہے کہ میں بھائی احرار الہدیٰ کے ساتھ ان سے ملنے لائبریری گیا ...میں اسی انداز میں ان کی طرف بڑھا جیسے ہمیشہ بڑھتا تھا...لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس مرتبہ انھوں نے بس سلام کا جواب دیا! احرار نے تعارف کرانے کی کوشش کی، میں نے روک دیا....پھر میں نے خود پوچھا کہ پہچانا نہیں؟....مایوسی بھرے لہجے میں کہا کہ نہیں! میں نے تعارف کرایا تو کہنے لگے معاف کرنا! یادداشت بہت متاثر ہوچکی ہے۔ پھر یکا یک جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا کہ چائے ...یہ ان کا ہمیشہ کا معمول تھا لیکن اس مرتبہ میں نے معذرت کی..کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا اور واپس آ گیا۔ اس کے بعد ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور اب اس دنیا میں ہونا ممکن بھی نہیں...۸۷/ برس کی بھرپور زندگی گزار کر رئیس الشاکری صاحب مالک حقیقی سے جا ملے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ہر جان دار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ محترم رئیس الشاکری صاحب بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ اب بس ان کی یادیں، ان کی باتیں ہیں جو انھیں ہمارے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ بال بال ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگزر فرمائے۔ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

اب نہ پائے گا زمانہ کبھی ان کی تمثیل
لاکھ ڈھونڈے کوئی جلتی ہوئی شمعیں لے کر

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

بقلم: محمد فرید حبیب ندوی

نام کتاب: ہندوستانی مسلمان اور اسلامی تشخص۔مسائل اور حل
مصنف: ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
صفحات: ۲۱۰
سن اشاعت: ۲۰۲۱
ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز، نئی دہلی
قیمت: ۱۹۵
ملنے کا پتے: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی

ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت اگر کوئی سب سے بڑا مسئلہ ہے، تو وہ ہے اپنے تشخص کی حفاظت و بحالی کا۔ یہ مسئلہ یوں تو ہر دور میں ان کے لیے چیلنج بنا رہا ہے؛ لیکن ادھر کچھ عرصے سے اس نے ان کے لیے سب سے اہم اور اولین مسئلے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایک طرف پہلے سے ہی مغربی تہذیب کی نقالی نے مسلمانوں کے تشخص کو نقصان پہنچا رکھا تھا، اب دوسری طرف مشترکہ کلچر کے تصور نے اس نقصان میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ پھر ادھر کچھ قریبی سالوں سے منصوبہ بند طریقے سے اس مشترکہ کلچر کو بزورِ قوت تھوپنے کی جو کوشش ہو رہی ہے، اس نے مسئلے کی سنجیدگی کو اور بھی بڑھا دیا ہے، اور یہ خطرہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس مشترکہ کلچر کے رنگ میں رنگتی جا رہی ہے۔ بڑی تعداد ہے جسے اپنے عقائد کا صحیح علم ہی نہیں، جس کے نتیجے میں وہ شرکیہ و کفریہ اعمال میں ملوث ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ ایک قلیل تعداد وہ بھی ہے جو کھلے عام ارتداد کا شکار ہو رہی ہے۔ اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو بہت مختصر تعداد ہے جسے اپنے اسلامی تشخص کا خیال ہو، اور جو اپنے لیے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے اپنے ملی تشخص کو بحال رکھنا چاہتی ہو۔ جب ابھی یہ صورت حال ہے تو آگے جو حالات آنے والے ہیں، خاص کر شہریت ترمیمی قانون (CAA) کے باقاعدہ نافذ العمل ہونے کے بعد جو مسائل اور چیلینجز پیش آنے ہیں، انھیں سامنے رکھا جائے تو یہ مسئلہ اور بھی خطرناک بن جاتا ہے۔

اس صورتِ حال میں ضروری اور بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ امت مسلمہ ہندیہ کو اس جانب متوجہ کیا جائے اور اسے مسئلے کی سنجیدگی سے باخبر کیا جائے۔ اس بنا پر علما اور دانشورانِ امت کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور ان پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعے امت کو خبردار کریں اور اسے اپنے تشخص کی حفاظت کی جانب متوجہ کریں۔

پیش نظر کتاب اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مشہور عالم و مفکر ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی ہیں، جو علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ اپنی گوناگوں خصوصیات اور اپنے سنجیدہ طرز تحریر اور مفید کتابوں کی بنا پر علمی دنیا میں معروف ہیں۔ یہ کتاب بھی ان کے سوزِ دروں، ملی تڑپ، دردِ دل اور وسعتِ مطالعہ و فکری بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ یہ دراصل ان کے ان مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے گزشتہ برسوں میں مختلف مناسبتوں سے سپردِ قرطاس کیے اور اب کتابی شکل میں یکجا شائع ہو رہے ہیں۔ مجموعۂ مقالات ہونے کی وجہ سے

کتاب میں یقیناً تشنگی محسوس ہوتی ہے، اور ایک مکمل کتاب کی جو خوبیاں ہوتی ہیں، جس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ مواد جمع کیا جاتا ہے، اس پہلو سے کتاب میں واقعی کمی کا احساس ہوتا ہے؛ لیکن مضامین، اپنے مواد اور ان میں پیش کیے گئے افکار ونظریات کی بنیاد پر، اس لائق ضرور ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے، اور ان سے استفادہ کیا جائے۔ یہ مضامین ضرور آپ کے علم میں اضافہ کریں گے اور سوچنے کے نئے زاویے وا کریں گے۔

کتاب میں کل چار باب ہیں، جن کے عناوین کچھ اس طرح ہیں:

پہلا باب: ہندوستانی مسلمان اور اسلامی تہذیب۔ دوسرا باب: دستور ہند اور اسلامی تناظر۔ تیسرا باب: مسلکی اختلاف اور اسلامی اتحاد، اور چوتھا باب: مسلم اقلیت اور اسلامی اقدار۔ ان ابواب میں اکیس مضامین ہیں، جن میں مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے نزدیک ہندوستان میں اسلام یا مسلمانوں کو تین بڑے چیلنج درپیش ہیں: (۱) ایمان اور عقیدے کا تحفظ۔ (۲) اعلی تعلیم کا حصول اور اپنی تاریخ سے صحیح واقفیت۔ (۳) اسلام کی فکری اور عملی دعوت۔

پہلے باب کے ایک مضمون بعنوان 'اسلامی فکر اور فقہ کے سامنے معاصر دنیا کے چیلنجز۔ غور وفکر کے چند پہلو' میں مصنف نے مندرجہ ذیل چیلنجز بیان کیے ہیں۔ فکری چیلنجز میں: (۱) اصلاح اسلام کی یا مسلمانوں کی؟ (۲) بدلتے نظریات۔ (۳) اسلامی تعلیمات کی غلط ترجمانی۔ اور فکری چیلنجز میں: (۱) شریعت کی ابدیت اور عصری ہم آہنگی۔ (۲) احکام شرع کی معقولیت، اور (۳) یسر وسہولت اور فقہی اختلاف سے استفادہ۔ ایک مضمون میں اسلامی تہذیب کے لیے مندرجہ ذیل خطرات ذکر کیے ہیں: (۱) عقیدہ وایمان کا مسئلہ۔ اس کے تحت تہواروں کے شرکیہ اعمال اور ٹی وی کے مشرکانہ پروگرام کا تذکرہ کیا ہے۔ (۲) حلال وحرام کی حدود کا مسئلہ۔ اس کے تحت بین مذہبی شادی، ناجائز اختلاط، لباس وپہناوا، غیر جنس کی مشابہت اور فحش نقش ونگار جیسی برائیوں کو بیان کیا ہے۔ (۳) طہارت وپاکی کا مسئلہ۔ (۴) تفریحات کا مسئلہ۔ (۵) مسلمانوں کی سماجی تصویر۔ اس کے بعد مصنف نے حل پیش کرتے ہوئے تین امور کی جانب رہنمائی کی ہے: (۱) شناخت کی تفہیم۔ (۲) اسلامی تہذیب کا جامع تعارف۔ (۳) نسلِ نو کی تربیت۔

دوسرے باب کے اندر مصنف نے دستورِ ہند اور اسلامی تعلیمات میں مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے، اور مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ جس طرح دستورِ ہند میں مذہبی آزادی، زندگی اور آزادی کا حق، امن وامان اور انصاف کا حصول، معاشی نابرابری کا خاتمہ، ماحولیات کی حفاظت اور ہم آہنگی واخوت کا فروغ اور تحقیقی مزاج کا فروغ جیسی بیش بہا قدریں ہیں، اسی طرح یہ سب قدریں اسلامی تعلیمات میں بھی ہیں؛ بلکہ اسلام ہی نے صحیح معنی میں تکمیلی انداز میں دنیا کو ان قدروں سے روشناس کرایا ہے۔

تیسرے باب میں مسلکی اتحاد پر زور دیا ہے، اور اختلاف میں اتحاد کی راہیں روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مسلکی شدت پسندیوں کا رونا بھی رویا ہے اور فروعی وجزوی مسائل میں شدت برتنے پر سخت تنقید کی ہے۔ ایک مضمون میں انھوں نے شیعہ سنی مسالک کے اندر ابتدائی دور میں موجود عناصرِ وحدت تلاشنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''اہل تشیع کے ان تین معروف فرقوں (اثنا عشری، اسماعیلی

اورزیدی) کے تعلق سے یہ بات بہت اہم ہے کہ آغاز تشیع کے بعد ابتدائی دور میں ایک طویل عرصے تک ان میں اوراہل سنت کے مسالک کے درمیان وہ دوری نظر نہیں آتی ہے، جو تیسری صدی ہجری کے بعد محسوس کی جانے لگی''۔(ص:۱۴۸)۔

مسلکی اتحاد کے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاسی اور ملی اتحاد پر بھی زور دیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:''پوری دنیا اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد ہورہی ہے...لیکن مسلم ممالک ٹکڑیوں میں بٹتے چلے جارہے ہیں اورنوع بہ نوع کے باہمی اختلافات کے بہ آسانی شکار بنتے چلے جارہے ہیں...لیکن عیار دشمن اب تک سادہ لوح مسلم اقوام کو یہی باور کراتے رہے کہ مسلم ممالک کے مسائل پوری ملت کے مسائل ہرگز نہیں، اپنے اپنے داخلی مسائل ہیں''۔(ص:۱۵۵)

اس باب کے آخری مضمون میں انھوں نے اختلاف کی درست تفہیم کی ہے اور اتحاد کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:''اتحاد کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ ہر فرقہ کا فرقِ فکر ونظر ختم ہوجائے یا یہ فرقے ایک دوسرے میں ضم ہوجائیں۔نہیں، اختلافِ فکر ونظر تو باقی رہے گا، نیز ضروری شناخت بھی باقی رہے گی؛ البتہ اختلاف کے ساتھ اتحاد اور اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت قائم کی جائے گی، یعنی دین کے وہ بنیادی امور جو ہم سب کے درمیان متفقہ ہیں، ان پر اشتراکِ عمل کیا جائے گا....اسی طرح ان باتوں سے قطعاً گریز کیا جائے گا، جو ایک دوسرے کی دل آزاری اور بدگمانی کا سبب بنتی ہیں''۔(ص:۱۶۷)۔

آخری باب میں مصنف نے مسلم اقلیتوں کے مسائل اور اسلامی اقدار پر روشنی ڈالی ہے۔اس ضمن مین انھوں نے حقوق کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات پیش کی ہیں، کہ کس طرح اسلام نے مساوات، تعلیم اور عدل وانصاف کا حق دیا ہے اور کس طرح اس نے اظہار رائے کی آزادی، اور مذہب کی آزادی کو تسلیم کیا ہے۔ایک مضمون میں انھوں نے انسانی آزادی کا اسلامی تصور پیش کیا ہے اور سمجھایا ہے کہ انسانی آزادی کا صحیح مطلب کیا ہے۔ایک مضمون مین اسلام کے نظریۂ امن وآشتی وخاتمۂ تشدد کو بیان کیا ہے۔آخری مضمون میں اقلیتوں کے مسائل اور حقوق شہریت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ذکر کیا ہے کہ اسلامی تعلیمات نے اقلیتوں کو کیا اور کیسے حقوق دیے ہیں۔

یہ ہے ان مضامین پر ایک سرسری نظر، جس سے آپ کو کتاب کے مندرجات کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا۔اگر آپ کتاب سے پوری طرح مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مکمل کتاب کا مطالعہ کیجیے اور قلب ونظر کو روشن کیجیے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب ہر صاحبِ شعور کے مطالعے کی چیز ہے۔مواد کے علمی وفکری ہونے کے ساتھ ساتھ طباعت وکاغذ بھی عمدہ ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب؛ البتہ بعض جگہ زبان واملا اور کتابت کی چند غلطیاں راہ پاگئی ہیں؛ لیکن ان سے کتاب کی افادیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔توقع ہے کہ اگلے ایڈیشن میں ان کی اصلاح کرلی جائے گی۔

مصنف اس مجموعۂ مقالات کی اشاعت پر ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔گو یہ مکمل کتاب نہیں؛ لیکن ایک مکمل کتاب کا مواد اپنے اندر ضرور رکھتی ہے۔اس بنا پر ہم مصنف سے بجا طور پر یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر باقاعدہ کوئی مکمل تصنیف پیش کریں گے۔وماذلک علی اللہ بعزیز۔

☆☆☆

نام کتاب:	اصلاح وفساد اور عروج وزوال کا قرآنی تصور
مصنف:	پروفیسر سید مسعود احمد
صفحات:	۱۱۲
سن اشاعت:	۲۰۲۰
ناشر:	ادارہ دعوت القرآن، لکھنؤ
قیمت:	مفت
ملنے کا پتہ:	یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، اور اقرأ کالونی، گلی نمبر ۴، علی گڑھ

زیرنظر کتاب پروفیسر سید مسعود احمد کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر سید مسعود احمد صاحب علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ یوں تو وہ سائنس کے آدمی رہے ہیں؛ لیکن قرآن سے ان کی وابستگی بالکل ابتدا ہی سے رہی ہے۔ وہ اپنے دور طالب علمی سے ہی درس قرآن دیتے رہے ہیں، اور اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اپنے ذاتی ذوق وشوق نے انھیں قرآن میں فکر وتدبر پر آمادہ کیا، اور وہ اس میں ایسے منہمک ہوئے کہ اللہ پاک کی توفیق سے قرآن واسلام کے موضوع پر ان کی دسیوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اور بعض ابھی زیر طبع ہیں۔

یہ کتاب بھی ان کے قرآنی تدبر اور غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر بڑی اہم اور چشم کشا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا مطالعۂ قرآن بڑا وسیع وعمیق ہے۔ اپنی بات پر وہ ایسی آیات سے استشہاد کرتے ہیں کہ لگتا ہے جیسے یہ آیت اسی سیاق میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو قرآنی آیات کا بہترین استحضار ہے اور وہ ضرورت کے وقت اپنے مطلب کی آیات لے آتے ہیں۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اصلاح وفساد کے قرآنی تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بتایا ہے کہ عملِ صالح الگ چیز ہے اور عملِ اصلاح الگ۔ کوئی عمل، صالح ہوسکتا ہے؛ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اصلاح کا بھی عمل ہو۔ مصنف کے بیان کے مطابق قرآن میں کلمۂ اصلاح کا ذکر تقریباً چالیس، جب کہ فساد کا لفظ پچاس جگہ آیا ہے۔ اصلاح کے دائرۂ کار کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے ذکر کیا ہے کہ اصلاح کا دائرہ تزکیۂ نفس اور اصلاح ذات سے ہوتا ہوا، اصلاح بین الناس اور اصلاح معاشرہ تک دراز ہوتا ہے۔ مختصر لفظوں میں اصلاح کا عمل، تزکیۂ نفس اور تطہیر معاشرہ کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ اصلاحی مشن ایمان باللہ، ایمان بالرسالہ اور ایمان بالآخرۃ کی گہری اور مخلصانہ بنیادوں پر قائم ہے۔ اصلاح سے مراد آفاقی اقدار مثلاً عدل وقسط، حسن اخلاق، تقوی واحسان اور فطرت کائنات وانسان سے ہم آہنگ اقدار ہیں، جب کہ فساد سے شرک وبدعات، ظلم و جور ریا واستکبار وبدمعاملگی، قطع رحمی وبربریت اور بحیثیت مجموعی دنیا پرستی اور مادہ پرستی مراد ہے۔ پھر مصنف نے قرآنی آیات کے حوالوں سے فساد کے تیس معانی بیان کیے ہیں۔ ان کے بقول: ''فساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مفہوم اس نظامِ حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام وقوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے، اور جس کی دعوت

انبیائے کرام علیہم السلام لے کر آئے ہیں''۔(ص:۲۵)۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں پر زبردست نقد کیا ہے جو اصلاح کے نام پر دین وشریعت میں اصلاح کی بات کرتے ہیں۔انھوں نے برحق لکھا ہے کہ''فی زمانہ اصلاحِ امت اور اصلاحِ دین میں فرق کرنے اوران کے مفاہیم کو طے کرنے اور سمجھنے کی بھی بہت ضرورت ہے۔اصلاح کے نام پر شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں تحریف کوراہ دینا اورمستند ومتواتر احادیثِ رسول کوتنقید کا نشانہ بنانا، نیز عدل وقسط اور مساوات انسانیت کے نام پرقرآنی آیات کی من مانی تاویلات کرکے تحریف معنوی کی جسارت کرنا اصلاح فی الدین کا کام نہیں ہے؛ بلکہ یہ فساد فی الدین کی تحریک قرار پاتی ہے''۔(ص:۱۲،۱۳)۔دوسری جگہ لکھتے ہیں:''لہذا اصلاح کے نام پر شریعت محمدی اور کتاب الٰہی کی نئی تعبیر عین تحریف قرآن ہے....بلکہ شیطانی سازش پر مبنی تحریکِ فساد ہے''۔

اصلاحِ امت اوراصلاحِ دین کے مضمون کومزید آگے بڑھاتے ہوئے مصنف نے دوسرا باب ہی یہ قائم کیا ہے کہ'کیا اسلام کسی اصلاح کا طالب ہے یا اسے صرف شارحین کی ضرورت ہے؟'۔

یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔اس سلسلے میں فی الوقت بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔کچھ ایسے مفکر اور دانشور بنے بیٹھے ہیں،جن میں سعودیہ کے ولی عہد بھی ہیں جو اسلام میں ترمیم اور کانٹ چھانٹ کی بات کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جوانسانوں اورلوگوں کی اصلاح کا کام کرنے کی بجائے،دین وشریعت کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں قرآن واحادیث اور فقہ وشریعت میں قابل اعتراض باتیں نظر آتی ہیں،اس لیے وہ دین وشریعت کا ایسا نیا ایڈیشن لانے کی بات کرتے ہیں جوان کے مغربی آقاؤں کی مرضی کے موافق ہو۔جس میں شتر بے مہار کی سی آزادی ہو،اور جس میں جہاد وقتال کے احکام بھی نہ ہوں،اورجس میں دین صرف چند مخصوص اعمال تک محدود ہو،اور وہ ایسا دین ہوجس کا کام محض چند مخصوص احکام میں رہنمائی دنیا ہو،اور جس کا حکومت وسیاست اور تہذیب وتمدن سے کوئی واسطہ نہ ہو۔چنانچہ وہ قرآن سے جہاد کی آیات خارج کرنے اور احادیث میں کانٹ چھانٹ کرنے کی بات کرتے ہیں۔مصنف نے ایسے لوگوں کی سخت پکڑ کی ہے،اوراس سلسلے میں صحیح نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔

اس ضمن میں انھوں نے ان لوگوں کے اعتراضات کا بھی رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ دین وشریعت اب پرانے ہوچکے ہیں،اورعلماء کی تشریحات نے دین میں ایسا بگاڑ پیدا کردیا ہے کہ اصل اسلام کوسمجھنا ناممکن ہوگیا ہے،اس لیے ضروری ہے کہ دین وشریعت کی ازسر نواصلاح کی جائے اوراس کے لیے کتبِ تفسیروحدیث کو دریابرد کردیا جائے۔مختصر الفاظ میں گویاان کا مقصود یہ ہے کہ آج اسلام کواحیاء وتجدید کی نہیں؛ بلکہ مکمل اصلاح کی ضرورت ہے۔

ان کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مصنف نے بالکل درست لکھا ہے کہ دین اوراسلام کوکبھی بھی اصلاح کی ضرورت نہیں رہی؛اس لیے کہ دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔اگر کبھی بگاڑ آیا بھی ہے تو اسلام اوردین حق میں نہیں آیا؛ بلکہ لوگوں کے عمل اورعقیدے میں فساد آیا،جس کی وجہ سے انبیاء کوبھیجا گیا۔اورانبیاء کرام تجدید دین واصلاح

معاشرہ کے لیے آتے تھے، نہ کہ دین میں ترمیم یا اصلاح کرنے کے لیے۔اور جہاں تک بات ہے شریعت کی تو اگر مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے نئے مسائل پیش آرہے ہیں تو مصنف کہتے ہیں کہ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں؛اس لیے کہ نئے مسائل تو ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں انھیں حل کیا گیا ہے۔اور جہاں تک بات ہے کہ امت میں عقیدۂ وعمل کا بگاڑ آ گیا ہے اور شاہ راہِ حق میں شرک وبدعات در آئے ہیں تو ان کی اصلاح کے لیے قرآن وسنت کی مستند تعلیمات کافی ہیں۔اور اصلاح کا یہ کام احادیث کی مدد کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے۔اس سلسلے میں مصنف نے ایسے دانشوروں پر سخت نقد کیا ہے اور ان کے اعتراضات کے محرکات کی طرف بھی مختصر اشارہ کیا ہے۔ان کے بقول ایسے لوگ اسلام کو غیروں کے چشمے سے دیکھتے ہیں اور انھوں نے مغربی افکار ومعیار کو اپنا قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے۔

یہ بھی بڑی قابل توجہ بات ہے۔موجودہ دور میں بعض مسلم دانشور علماء کی تشریحات اور محدثین کرام کی بے مثال خدمات سے لوگوں کو بدظن کرنے کے مشن پر لگے ہوئے ہیں۔یہ دانشور امت کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ نعوذ باللہ امت میں موجود فرقہ بندی وانتشار کے ذمے دار علماء ومحدثین ہیں،اس لیے ان کی تمام کتابوں اور کاوشوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔مصنف نے ایسے لوگوں کا بھی سخت نوٹس لیا ہے،اور سلف صالحین اور علماء ومحدثین کی کاوشوں کی تحسین وقدر افزائی کی ہے،اور بالکل درست طور پر اقرار کیا ہے کہ ہم سلف صالحین کی تشریحات وخدمات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ساتھ ہی مصنف نے ان روایت پسند علماء پر بھی نقد کیا ہے جو بدلتے حالات میں بھی فروعات سے متعلق اپنی قدیم آراء سے ہٹنے کو تیار نہیں۔

تیسرے باب میں بین الانسانی ربط وتعاون کی قرآنی بنیادوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اور اس کا موضوعِ کتاب سے تعلق اس طرح ہے کہ ''چونکہ اصلاح وفساد کا براہ راست تعلق بین الانسانی رشتوں اور رویوں سے ہے،لہذا اگر کسی ایک جگہ کے رہنے والے لوگوں کے درمیان صحت مند ربط وتعلق قائم نہ ہو تو کبھی نہ کبھی جھگڑا وفساد برپا ہوگا۔اس کے برعکس اگر بین الانسانی رشتے امن وآشتی اور اخوت ومساوات کی بنیاد پر قائم ہوں تو سبھی لوگ ایک دوسرے کی اصلاح کی طرف مائل ہوں گے،اور آپسی محبت ویگانگت کا ماحول قائم ہوگا''۔(ص:٦)۔چنانچہ اس ضمن میں مصنف نے ان آیات کو کوڈ کیا ہے جو مسلمانوں کے باہمی یا غیر مسلموں کے ساتھ ان کے رشتوں کو بیان کرتی ہیں۔

چوتھے باب میں سماجی برائیوں کے انسداد کی قرآنی اپروچ اور حکمت عملی بیان کی گئی ہے۔اس سلسلے میں پہلے سماجی برائیوں کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔پھر ان مختلف قسموں میں سے پانچ بڑی بڑی برائیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے،جو اس طرح ہیں:

(۱)شرک۔(۲)اباحیت پسندی واستکبار۔(۳)ہم جنس پرستی۔(۴) معاشی بگاڑ۔اور(۵)فساد اور عدم مساوات پر مبنی نظام۔

مصنف کے بیان کے مطابق قرآن میں سماجی برائیوں کو روکنے کی مختلف سطحیں ہیں۔پہلی سطح،اخلاق وضمیر اور انسانی اقدار پر قائم ہے۔دوسری سطح قانون سازی اور

پولیس وعدالت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔تیسری سطح اعتقادی سطح پر ہے،اور برائیوں کوروکنے کا یہ سب سے طاقت ورمحرک ہے۔اس لیے کہ اسلامی تصور حیات کے مطابق انسان اپنے خالق ومالک کے حضور جواب دہ ہے،جس کی وجہ سے وہ برائیوں سے رکا رہتا ہے۔اس کے ساتھ ہی برائیوں کے انسداد کے لیے قرآن ترغیب وترہیب سے بھی کام لیتا ہے۔پھر باب کے آخر میں غلامی کے مسئلے کو لیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کس طرح اسلام نے غلامی کی رسم کا انسداد وخاتمہ کیا۔

پانچویں باب میں عروج وزوال کے قرآنی تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ضمن میں پہلے امت مسلمہ کے منصب ومقام کو بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد اصل موضوع پر بحث کی گئی ہے۔مصنف کے نقطۂ نظر کے مطابق عروج وزوال کی دو قسمیں کی ہیں: مادی عروج وزوال اور معنوی عروج وزوال۔اور قرآن میں عروج سے ہر جگہ مادی عروج ہی مراد نہیں ہوتا؛ بلکہ بعض؛ بلکہ بیشتر مقامات پر معنوی عروج بھی مراد ہوتا ہے۔اگر چہ قرآن میں ہی جابجا مادی عروج کی بھی بات کہی گئی ہے،اور ایمان وعمل صالح والوں سے مادی عروج کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔مگر یہ وعدہ مصنف کے خیال کے مطابق صلاحیت اور صالحیت دونوں سے مشروط ہے۔اس لیے نہ صلاحیت کی ضرورت کی نفی کی جاسکتی ہے،اور نہ صالحیت کی۔چنانچہ قرآن نے جہاں طالوت اور حضرت سلیمان وحضرت داؤد کے واقعات میں صلاحیت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے،وہیں بعض مقامات پر صالحیت کی ضرورت بھی بیان کی ہے؛ بلکہ کبھی کبھی اخلاقی وروحانی عوامل،سیاسی ومادی عوامل پر سبقت لے جاتے ہیں۔بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مصنف نے سائنسی علوم کی ضرورت کو بھی اجاگر کیا ہے۔اور اس سلسلے میں قرآنی آیات سے رہنمائی لیتے ہوئے یہ درست نتیجہ پیش کیا ہے کہ قرآن سائنسی علوم اور تسخیر کائنات پر ابھارتا ہے۔وہ ان چیزوں کی نفی نہیں کرتا۔پھر آخر میں عروج وزوال کے معاشی،معاشرتی اورنفسیاتی عوامل سے بحث کی ہے۔خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے عروج وزوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے معتدل راہ اختیار کی ہے۔نہ انھوں نے روحانی واخلاقی پہلو کو نظر انداز کیا ہے،اور نہ ہی مادی اور سیاسی وعسکری پہلو؛ بلکہ دونوں کے درمیان بہترین توازن قائم رکھنے کی بہترین کوشش کی ہے۔

کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے جہاں بھی کوئی بات کہی ہے تو اپنی بات کو قرآنی حوالوں سے مؤید کیا ہے۔دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر باب کے آخر میں پورے باب کا خلاصہ پیش کردیا گیا ہے،جس سے پڑھا ہوا مضمون دوبارہ نظر سے گزر جاتا ہے۔

مصنف کی یہ کاوش بڑی قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔کتاب ذہن ودل کے دریچے کھولتی ہے اور فکرونظر کے نئے افق وا کرتی ہے۔ہر صاحب علم ونظر کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

☆☆☆